بارے شوکت کا
کچھ بیاں ہو جائے

مشتاق اعظمی

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

تعارف

نام : مشتاق اعظمی

والد : ڈاکٹر شاہ محمد مرحوم

والدہ : کلثوم بی بی مرحومہ

تاریخ پیدائش : 03 نومبر 1944

جائے ولادت : اعظم گڑھ (یوپی)

تعلیم : بی۔ اے۔ انگلش آنرز، بردوان یونیورسٹی
بی۔ اے اردو آنرز، ایم۔ اے،
پی۔ ایچ۔ ڈی (اردو) کلکتہ یونیورسٹی

تعلیمی مراکز : اعظم گڑھ، آسن سول، کلکتہ

کتابیں : ۱) آدھا آدمی (افسانے)
۲) نارسیدہ (افسانے)
۳) کھلونا اور دوسری کہانیاں (بچوں کا ادب)
۴) کنکر منتر (بچوں کا ادب)
۵) تاریخ پارے
۶) قطرے لہو کے (آسن سول کے
چار شاعروں کا تذکرہ منتخب کلام کے ساتھ)
۷) شیش محل
۸) بیدی میرا ہمدم میرا دوست
(اوپندرناتھ اشک کی ہندی کتاب کا اردو ترجمہ)

زیر اشاعت : ۱) زیر نظر کتاب
۲) اشارات و ارشادات (مضامین)
۳) یہ دھواں سا (افسانے)

سلسلۂ معاش : ٹی۔ ڈی۔ بی کالج رانی گنج سے ریڈر
اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے
سبک دوشی کے بعد وظیفہ یاب

بارے شوکت کا
کچھ بیاں ہو جائے

(شوکت تھانوی اور دیگر اہلِ قلم)

IQBAL LIBRARY
PUBLI[illegible] (REGD.)
PHONE 2542655
POST BOX No. 20

انتخاب و تشکیل

مشتاق اعظمی

مشتاق اعظمی
Dr. Mushtaque Azmi
Former Head Deptt. of Urdu T.D.B. College, Raniganj (W.B.)
Residence: Azmi Mansion, 25 G. C. Mitra Road
Kishori Gali, Asansol - 713301 (W.B.)
Mob. : 9002140625

بارے شوکت کا کچھ بیاں ہو جائے

© سیمیں رخسار

کتاب کا نام : بارے شوکت کا کچھ بیاں ہو جائے
انتخاب و تشکیل : مشتاق اعظمی
صفحات : 256
تعداد : 500
سال اشاعت : 2022ء
کمپوزنگ : ضیاء الحق
قیمت : -/200 روپے
زیر اہتمام : نسیم فائق (9123620415)
مطبع : اضحیٰ پبلی کیشنز

RURAL LIBRARY BHOPAL
Access 14602
Class الف
Book No. 14602
Date 7/7/23

BARE SHAUKAT KA KUCHH BAYAN HO JAE

Compiled by : **MUSHTAQUE AZMI**
Year of publication : **2022**
Published by : **Azha Publication**
170, Keshab Chandra Sen Street,
Kolkata - 700 009

یہ کتاب مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

انتساب

امّاں، ابّا

——— کے نام

رات باقی تھی جب وہ بچھڑے تھے
کٹ گئی عمر، رات باقی ہے

اشاریے کنایے

بقلم خود — مشتاق اعظمی — 05
قاعدہ بے قاعدہ (مکمل کتاب) — شوکت تھانوی — 19

● **متفرقات**

❖ جگر مرادآبادی — 100
❖ نقوش کے نقاش — 106
❖ پنڈت مدن موہن مالوی — 115
❖ تعزیت — 117
❖ ب — 126
❖ بخیالِ خویش خبطے — 132

● **کچھ یادیں کچھ باتیں**

❖ خودنوشت — 142

● **بیادِ شوکت**

❖ شوکت تھانوی مرحوم — عبدالماجد دریابادی — 209
❖ میرا رفیق — قدرت اللہ شہاب — 211
❖ ایک مہذب ظرافت نگار — قرۃ العین حیدر — 212
❖ باغ و بہار شخصیت — حفیظ جالندھری — 220
❖ شوکت تھانوی کی یاد میں — فیض احمد فیض — 226
❖ گوہر مخزنِ ظرافت — کنہیالال کپور — 228
❖ میرا بھیا — خاتون ارشد — 234
❖ ابا — رشید عمر تھانوی — 245
❖ میری سرگزشت — شوکت تھانوی — 254

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

بقلم خود

اُردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت بہت قدیم ہے۔ اُردو نثر میں طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش ہمیں داستانوں میں مل جاتے ہیں۔ فقرے بازی، الہڑ پن، عریانیت، غیر معیاری لطائف اور فحش قصوں سے ہماری داستانیں بھری پڑی ہیں، لیکن یہ ساری چیزیں ظرافت کے معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ ابتدائی دور میں مرزا محمد رفیع سوداؔ کی شاعری میں بھی اس کے نمونے ملتے ہیں لیکن حقیقتاً معیاری ظرافت کا سہرا مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ ہی کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار اور خطوط کے ذریعے طنز و مزاح کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ ظرافت، غالبؔ کے مزاج کا جزو تھی جو اُن کے اشعار، گفتار اور خطوط میں نظر آتی ہے۔ انہوں نے وہ طرز اختیار کیا جس میں طنز کے ساتھ مزاح بھی شامل تھا۔

غالبؔ کے مزاج کی خصوصیت یہی تھی کہ وہ زبوں حالی پر، غلط بات پر، انسانی کمزوریوں پر، یہاں تک کہ اپنے آپ پر بھی ہنس لیتے تھے۔ انہوں نے خود پر ”غالبِ خستہ“ اور ”بادہ خوار“ جیسی پھبتی بھی کسیں۔ دوسروں کا مذاق اُڑانا آسان ہے لیکن جب کوئی شخص اپنا مذاق خود اُڑائے یا خود پر طنز کرے تو اس کی اعلیٰ ظرفی میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے ان ہی خصوصیات کی بنا پر حالیؔ نے غالبؔ کو ”حیوانِ ظریف“ کہا، جس سے ان کے مزاج اور اُفتادِ طبع کی صحیح نشان دہی ہوتی ہے۔ غالبؔ ہی کے بعد نثر میں مزاح کی اعلیٰ روایت کا آغاز ہوا۔ غالبؔ کے بعد ڈپٹی

نذیر احمد کے ناول ”توبۃ النصوح“ میں ”مرزا ظاہر دار بیگ“ جیسا یادگار مزاحیہ کردار سامنے آیا۔

طنز و مزاح کو فروغ دینے میں ”اودھ پنچ“ کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، اگرچہ اس کے مزاح کا معیار، غالبؔ سے مختلف تھا لیکن پہلی بار اخبار نے مزاحیہ انداز میں پیش کش کا بھرپور رول ادا کیا۔ ”اودھ پنچ“ 1877ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے جو خود اعلیٰ درجے کے ادیب تھے۔ ان کی تصانیف ”حاجی بغلول“، ”طرح دار لونڈی“ اور ”احمق الدین“ کو کافی شہرت ملی۔ رتن ناتھ سرشارؔ نے ابتدا میں ”اودھ پنچ“ کے لیے لکھا۔ اس کے بعد انہوں نے ”فسانۂ آزاد“، ”اودھ اخبار“ میں قسط وار شائع کیا۔ سرشارؔ ہی نے اُردو کو لازوال مزاحیہ کردار ”خوجی“ کی شکل میں عطا کیا۔

نواب سید محمد آزادؔ، مرزا مچھو بیگ، ستم ظریفؔ، تربھون ناتھ ہجرؔ، احمد علی شوقؔ، فدا حسین، منشی محفوظ علی کاکوری وغیرہ ”اودھ پنچ“ کے اہم قلم کار تھے۔ ”اودھ پنچ“ کے بعد سے تقسیم ہند تک لکھنے والوں میں مہدی افادی، محفوظ علی بدایونی، خواجہ حسن نظامی، قاضی عبد الغفار اور ملا رموزی وغیرہ شامل ہیں۔ مزاح نگاروں کی فہرست میں مرزا فرحت اللہ بیگ، سید احمد شاہ بخاری، پطرس، امتیاز علی تاجؔ، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، کرشن چندر، شوکت تھانوی وغیرہ کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

شوکت تھانوی ایک بلند پایہ مزاح نگار، اخبار نویس، ادیب اور شاعر تھے۔ ان کی طبیعت میں مزاح رچا بسا ہوا تھا۔ ان کے قلم سے خواہ کتنا ہی سنجیدہ مضمون لکھا جاتا، ان کی فطری مزاح نگاری کی صلاحیتیں نمایاں ہو کر ہی رہتیں۔ شادی ہو یا غمی ہر موقع پر شوکت تھانوی کی فطرتِ لطیف، پژمردہ سے پژمردہ انسان کو بغیر ہنسائے نہیں چھوڑتی تھی۔ زبان و بیان پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ ان کے تخیل میں روانی اور تسلسل تھا۔ افسوس کہ انہوں نے طویل عمر نہیں پائی لیکن اس مختصر مدت میں اردو زبان و بیان کو زندہ قہقہے، مسکراہٹیں، چٹکیاں اور گدگدیاں دی ہیں۔ بقول محمد طفیل (ایڈیٹر نقوش):

> ”شوکت صاحب کی عمر 50 برس کی تھی مگر عمروں کو برسوں کے اعتبار سے ناپنا نہیں چاہیے۔ عمر اُن کی زیادہ ہوتی ہے جو کام زیادہ کرتے ہیں۔ آپ ان لوگوں کے بارے میں سوچیں جو دفن ہونے سے پہلے مَر جاتے ہیں اور ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو دفن ہونے کے بعد بھی نہیں مَرتے۔“

شوکت تھانوی کا خاندانی نام محمد عمر تھا۔ ان کا آبائی وطن تھانہ بھون (ضلع شاملی۔ مغربی یوپی) ہے اسی نسبت سے ان کے نام کے ساتھ ”تھانوی“ کا لاحقہ ہے مگر ان کی پیدائش 2رفروری 1904ء کو بندرابن ضلع متھرا میں ہوئی۔ ان کے والد صدیق احمد بھوپال میں انسپکٹر جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ روایت کے مطابق انہوں نے ابتدائی تعلیم بھوپال میں حاصل کی، پھر جب والدِ محترم نے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تو لکھنؤ کے مِشن ہائی اسکول میں شوکت کا داخلہ کروادیا گیا، بعدہٗ انہوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد سے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل نہ ہونے کی صورت میں انہوں نے کلکتے سے امتحان پاس کیا۔ ان کی تعلیم کے سلسلے میں یہ رائے مشہور ہے کہ وہ سند یافتہ طالب علم نہیں تھے لیکن قدرت نے انہیں بلا کی ذہانت عطا کی تھی۔

انگریزی، فارسی اور اُردو زبان میں انہیں مہارت حاصل تھی، وہ انگریزی اخبارات کی خبروں کا بہترین اُردو ترجمہ کرلیا کرتے تھے۔ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ فطری صاحب قلم کو کسی ڈگری یا سند کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کا بلند پرواز تخیل اور رنگ آمیز تحریریں خود اُس کی شخصیت کا انفراد بن جاتی ہیں۔ شوکت اگرچہ صحافت سے متعلق رہے لیکن انہوں نے ادب کا دامن نہیں چھوڑا، نثر و نظم میں باقاعدہ اپنی فطری صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہے، شاعری کی، افسانے لکھے اور ناول بھی تحریر کیا۔

محمد عمر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ خود شوکت تھانوی کی زبانی سنیے:

''میری ایک غزل چھپ گئی۔ کچھ نہ پوچھیے میری خوشی کا عالم، میں نے وہ رسالہ کھول کر ایک میز پر رکھ دیا تھا کہ ہر آنے جانے والے کی نظر اس غزل پر پڑ سکے مگر شامتِ اعمال کہ سب سے پہلی نظر والد صاحب کی پڑی انہوں نے یہ غزل پڑھتے ہی ایسا شور مچایا کہ گویا چور پکڑ لیا ہو، والدہ محترمہ کو بلا کر کہا: آپ کے صاحب زادے فرماتے ہیں کہ:

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے
ترے کوچے میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

میں پوچھتا ہوں کہ یہ جاتے ہی کیوں ہیں، کس سے پوچھ کر جاتے ہیں۔ والدہ بے چاری سہم کر رہ گئیں اور خوف زدہ آواز میں کہا:

''غلطی سے چلا گیا ہوگا۔''

(مابدولت)

والد کے انتقال کے بعد فکرِ معاش نے انہیں صحافت کی طرف متوجہ کیا اور لکھنؤ کے اخبار ''ہمدم'' میں ٹائپسٹ مقرر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ روزنامہ ''ہمدم'' ○ کا مزاحیہ کالم ''دو دو باتیں'' شوکت تھانوی کے نام سے لکھتے تھے۔

ان کا پہلا مزاحیہ مضمون ''میٹھے چاول'' ہے جسے بابائے صحافت سید جالبؔ دہلوی نے پڑھ کر انہیں فکاہیہ کالم لکھنے کی ہدایت دی۔ آخر میں سید جالبؔ دہلوی نے ''ہمدم'' کا چارج ان ہی کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ''اودھ اخبار'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے اور ساتھ ہی اپنا ذاتی روزنامہ ''طوفان'' بھی جاری کیا۔ ان کے مزاحیہ مضمون ''سودیشی ریل'' نے جو ''نیرنگ خیال'' 1928ء کے سالنامے میں شائع ہوا انہیں کافی مقبولیت بخشی۔ یہیں سے بحیثیت مزاح نگار شوکت تھانوی کا تشخص بنا۔

''ہمدم'' سے وابستگی کا قصہ یوں ہے کہ اس کے مالک خان بہادر سید احمد حسین رضوی

تھے، میر بشارت حسین جالبؔ دہلوی اس کے ایڈیٹر۔ خان صاحب ہی کی سفارش پر جالبؔ دہلوی نے شوکت تھانوی کو اخبار کے عملے میں شامل کرلیا۔ اب آگے کی کہانی شوکتؔ تھانوی کی زبانی سنیے:

> ''مختصر یہ کہ ''ہمدمؔ'' میں ملازم ہو گئے۔ میر صاحب نے رگیدنا شروع کردیا۔
>
> ہمارے سیاہ حروف کی عبارت پر اُن کی سرخ رنگ کی اصلاح ہونے لگی۔ شروع شروع میں تو سیاہ عبارت تمام کی تمام قلم زد ہوجاتی تھی اور اس کی جگہ میرؔ صاحب کی سرخ عبارت ہماری نالائقی پر خون کے آنسو بہاتی نظر آتی تھی۔ اس کے بعد سیاہ و سرخ عبارت کا تناسب ایسا ہو گیا کہ گویا قتل عام تو ہوا تھا مگر کچھ ہندوستان بچ گئے تھے سرکاری گواہ بننے کے لیے۔
>
> رفتہ رفتہ خون کی ایک آدھ چھینٹ اور پھر خال خال سرخ رنگ کی چمک مگر یہ کبھی نہ ہُوا کہ کوئی چیز اصلاح کے بغیر رہ گئی ہو۔ ترجمہ ہو، شذرہ ہو، مزاحیہ کالم ہو، ہر جگہ اصلاح موجود۔ اکثر تو اصلاح پر غصہ ہی آتا تھا آخر ایک مرتبہ ہمت کرکے لڑ بیٹھے ہم نے لکھا تھا ایک جگہ ''نقطۂ نگاہ'' آپ نے اس کو کاٹ کر لکھ دیا ''زاویۂ نگاہ''۔ بلبلاتے ہوئے وہ اصلاح لے کر میرے صاحب کے پاس پہنچے۔ ''آپ نے نقطۂ نگاہ کاٹ کر زاویۂ نگاہ بنادیا ہے۔ اس میں کیا فرق ہوگیا۔'' سر جھکائے ہوئے بولے:
>
> ''بہت بڑا فرق ہے دونوں میں ''نقطۂ نگاہ'' تیقن کے موقع پر استعمال ہوتا ہے گویا آپ کی نظر پورے وثوق کے ساتھ ایک خاص نقطے پر ہے اور ''زاویۂ نگاہ'' میں شک کا احتمال باقی رہتا ہے گویا نگاہ

> نے نقطے تک پہنچنے کا ایک زاویہ تو بنا لیا ہے مگر ابھی وہ نقطہ دریافت نہیں کیا ہے جس پر آپ نے لکھا ہے وہاں زاویہ نگاہ زیادہ سچا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ سائنس کمیشن کے متعلق ہمارا ''نقطۂ نگاہ'' اب اگر ''زاویہ نگاہ'' لکھ دیجیے تو پھر آپ پر نتیجے کی ذمے داری نہیں رہتی۔ اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ سائنس کمیشن کا مقصد اپنے نتیجے پر پہنچ کر عین تدبر ثابت ہو اس وقت اگر زاویہ نگاہ غلط بھی ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے مگر نقطۂ نگاہ کا غلط ہونا ایک صحافی کی موت ہے۔''

لکھنؤ میں شوکتؔ تھانوی اور نسیمؔ انہونوی کی دانت کاٹنے کی دوستی تھی۔ ایک بار دونوں نے مل کر مشہور فرضی نام سے ناول لکھنے کا ایک عجیب و غریب سلسلہ شروع کیا۔ ناول پر پبلشر کا نام نہیں ہوتا تھا۔ نوجوان نسل عموماً (لڑکے اور لڑکیاں) ان ناولوں پر کاغذ کا غلاف چڑھا کر تنہائی میں پڑھتے تھے اور اپنے شہوانی جذبات کی تسکین کرتے تھے۔ بوڑھے ان ناولوں کو معجونِ شباب آور جان کر پڑھتے اور سنتے تھے۔

(بحوالہ: مضامین احمد جمال پاشا، یوپی اردو اکاڈمی)

شمس الرحمٰن فاروقی نے ان تحریروں کو خان محبوب طرزی سے منسوب کیا ہے۔

(ملاحظہ فرمائیں کتاب خان محبوب طرزی از ڈاکٹر عمیر منظر)

ان ناولوں نے اُردو دُنیا میں وہ ہنگامہ مچایا کہ الامان والحفیظ!

(اللہ ان کی مغفرت کرے۔ یہ بات ضمناً احاطۂ تحریر میں آ گئی۔)

سن 19 کی پانچویں دہائی کے آغاز میں مطلعِ ادب پر ابنِ صفی نمودار ہوئے اور الٰہ آباد سے ماہنامہ ''جاسوسی دُنیا'' کا اجرا ہوا۔ ابنِ صفی کی شگفتہ زبان اور تجسس سے بھری کہانیوں نے تہلکہ مچا دیا۔ قدرت نے ابنِ صفی کو زود نویسی عطا فرمانے میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ وہ بیک وقت دو دو ناولیں لکھنے کا ڈول ڈال دیتے تھے۔ لکھنؤ میں فرضی نام سے لکھے جانے والے

ناولوں کا سحر ابن صفی کی تحریروں نے توڑ دیا۔

بات ہو رہی تھی شوکت تھانوی اور نسیم انہونوی کے دوستانہ تعلقات کی، یہاں پر یہ ذکر شاید بے محل نہ ہوگا کہ دونوں کی شاہد احمد دہلوی سے جب پہلی ملاقات ہوئی تو کیا واقعہ پیش آیا:

> ”جاڑوں کے دن تھے۔ میں نے ان حضرات سے کہا کہ آپ کل صبح ہمارے ساتھ نہاری کھائیے۔ یہ دلّی کی ایک خاص چیز ہے اور دلّی والے ہی اس کا اہتمام کرتے ہیں مگر اس کے کھانے کا لطف علی الصباح کا ہے اس لیے آپ حضرات چھ بجے آجائیے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ماموں چشتی صاحب سے کہا کہ کل صبح کے لیے نہاری کا انتظام کر دیجیے۔ میں خود چوں کہ رات کو دیر سے سوتا ہوں اس لیے صبح دیر سے اٹھتا ہوں۔ اس دن الارم لگا کر اٹھا۔ چشتی صاحب نہاری کا دیگچہ اور دوسرے لوازم لیے ہوئے چھ بجے سے پہلے پہنچ گئے۔ انگیٹھی دہکائی گئی۔ اس پر گھی کڑکڑایا گیا۔ نہاری پر سے تار اُتار کر الگ کر دیا گیا اور جب گھی میں پیاز سرخ ہوگئی تو پیاز ایک الگ پیالے میں نکال لی اور گھی سے نہاری کو داغ دیا۔ چھ بجے، ساڑھے چھ بجے، سات بجنے لگے، چشتی صاحب نے کہا ”بھئی تمہارے مہمان نہیں آئے“ میں نے کہا، لکھنؤ والے ہیں۔ تکلف میں کہیں رہ گئے، بس آتے ہی ہوں گے۔ ”لو صاحب، سات بھی بج لیے، ساڑھے سات ہونے کو آئے۔ انتظار میں طبیعت بڑی بدمزہ ہوئی۔ جوانی کی ترنگ، اس زمانے میں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ جب آٹھ بجے تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ میں نے چشتی صاحب سے کہا: ”ماموں جان! یہ سارا سامان زنانے میں بھیج دیجیے۔“ وہ گھبرا کر بولے: ”کیوں میاں کیوں؟ تھوڑا سا انتظار اور

کرلو۔" مگر میرا پارہ چڑھ چکا تھا۔ میں نے کہا: "اب اگر وہ آئیں گے بھی تو میں نہیں کھلاؤں گا۔" ماموں جان نے کہا: یہ بڑی نامناسب بات ہوگی۔" مگر میں نے سارا سامان اُٹھوا کر اندر بھیج دیا اور خود بھی اندر چلا گیا۔ کوئی نو بجے دونوں حضرات تشریف لائے۔ مجھے اطلاع ہوئی کہ مہمان آگئے۔ میں نے بیوی سے کہا: "چائے اور پان بھیج دینا۔" انہوں نے پوچھا: "اور نہاری؟" میں نے کہا: "اب وہ نہاری کہاں رہی، وہ تو باسی قورمہ ہوگیا۔ اسے مت بھیجنا۔" انہوں نے سر کو حرکت دی جیسے کہہ رہی ہوں: "عجب اوندھی مت کا آدمی ہے۔" اور باورچی خانے میں خاموش چلی گئیں۔ میں مردانے میں آیا تو شوکت صاحب نے کہا:

"ہمیں کچھ دیر ہوگئی۔" میں نے کہا: "جی ہاں۔"

حریفان بادہ ہا خوردند و رفتند!

بولے "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ سے ملانے کے لیے جن احباب کو بلایا تھا۔ انہوں نے دو گھنٹے تک آپ کا انتظار کیا۔ اس کے بعد کھا پی کر رخصت ہوگئے۔"

"یعنی نہاری ختم؟"

"جی ہاں، دلّی کے شرفا سورج نکلنے سے پہلے ہی نہاری کھا چکتے ہیں۔ ویسے بازاروں میں مزدوروں اور کام پیشہ لوگوں کے لیے دن چڑھے تک بکتی رہتی ہے۔"

"یہ تو برا ہوا۔"

"وقت کی پابندی نہ کرنے کا نتیجہ برا ہی ہوتا ہے۔ اب آپ کچھ اور

باتیں کیجئے۔
کہیے، کل کس کس سے ملے۔"

(چند ادبی شخصیتیں)

قلم برداشتہ نویسی کا یہ مظاہرہ آپ نے شاذ ہی کہیں دیکھا ہو کہ شوکت تھانوی نے محمد طفیل ''مدیر نقوش'' کو ایک خط لکھا کہ لکھنؤ آیئے۔ آم کھایئے اور ایک ناول لے جایئے۔ طفیل صاحب لکھنؤ آگئے۔ رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ناول طلب کیا تو شوکت نے انہیں قلم اور کاغذ کا ایک دستہ پکڑاتے ہوئے کہا: ''لکھیے ناول'' اس کے بعد شوکت تھانوی بولتے گئے اور محمد طفیل لکھتے گئے۔ جب فجر کی اذان ہوئی تو ناول مکمل ہو چکا تھا اس ناول کا نام ہے ''بیوی''۔

شوکت نے 1938ء میں صحافت سے کنارہ کشی اختیار کی اور ریڈیو سے وابستہ ہو گئے پاکستان منتقل ہونے کے بعد وہ لاہور ریڈیو سے منسلک ہوئے اور فیچر نگاری کرنے لگے، ان کے ریڈیو پروگراموں میں ''قاضی جی'' کو خاصی مقبولیت ملی جس میں مرکزی کردار یعنی ''قاضی جی'' وہ خود تھے، اطلاع یہ بھی ہے کہ وہ لاہور کے ایک فلمی ادارے ''پنچولی آرٹس پکچرز'' میں بھی کام کر چکے تھے جہاں فلمی کہانیاں لکھنا اور مکالمہ نگاری ان کے فرائض میں شامل تھا۔ 1957ء میں وہ لاہور سے کراچی چلے گئے اور ''قاضی جی'' کے پروگرام کا سلسلہ کراچی میں بھی جاری رکھا، اُسی برس 16/اگست کو پاکستان کے مشہور روزنامہ جنگ میں شمولیت اختیار کر لی جہاں دیگر ذمے داریوں کے ساتھ روزانہ فکاہی کالم ''وغیرہ وغیرہ'' لکھنے لگے، 13/نومبر 1959ء کو جب روزنامہ جنگ کے راولپنڈی ایڈیشن کا اجرا ہوا تو ادارۂ جنگ کی طرف سے شوکت تھانوی کو راولپنڈی بھیجا گیا جہاں اخبار مذکور کی ادارتی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ روزانہ فکاہی کالم بھی لکھنے لگے جو ''وغیرہ وغیرہ'' کے بجائے ''پہاڑ تلے'' کے عنوان سے شائع ہوتا تھا، روایت ہے کہ شوکت تھانوی اخیر زندگی تک ادارۂ جنگ سے متعلق رہے۔

اپنے وقت کے مشہور صحافی شفیع عقیل شوکت تھانوی کو یاد کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ”شوکت تھانوی انتہائی درجے کے زودنویس تھے اور یہی نہیں وہ ’صاف نویس‘ بھی تھے صفحات کے صفحات لکھتے چلے جاتے تھے اور کہیں کوئی لفظ کاٹ کر دوبارہ لکھنے کی نوبت نہ آتی تھی، مجھے ان کے کئی مسودے خود دیکھنے کا اتفاق ہوا، پورے مضمون یا کالم میں کہیں الفاظ یا سطور کٹی ہوئی نہیں ہوتی تھیں، ایک بار تو میں نے ان کے ایک ناول کا پورا مسودہ دیکھا تو شروع سے آخر تک کہیں کوئی لفظ کاٹ کر دوبارہ نہیں لکھا گیا تھا اور نہ ہی متن میں تبدیلی کی گئی تھی، غالباً کم وقت میں زیادہ لکھنے ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کی تصانیف کی کثیر تعداد ہے، جن میں ناول، افسانے، مضامین، ڈرامے اور فکاہیے وغیرہ شامل ہیں۔“

شوکت تھانوی کی مشہور کتابوں کے نام یوں ہیں:

موجِ تبسم، بحرِ تبسم، سیلابِ تبسم، طوفانِ تبسم، بارِ خاطر، جوڑ توڑ، سنی سنائی، خدانخواستہ، بکواس، بقراط، قاعدہ بے قاعدہ، اُلٹ پھیر، لاہوریات، قاضی جی، منشی جی، بھابی..... وغیرہ، انہوں نے خاکوں کا بھی ایک مجموعہ لکھا تھا جو ”شیش محل“ کے نام شائع ہوا، اسی طرح ان کی خود نوشت سوانح عمری بھی ”مابدولت“ کے عنوان سے چھپی، یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب ”کچھ یادیں“ اور شعری مجموعہ ”گہرستان“ بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔ شوکت کی مقبولیت اور شہرت آسمان چھو رہی تھی کہ اپریل 1963ء کے اواخر میں ان کی طبیعت اچانک خراب ہوئی۔ پہلے اسے معمولی بیماری سمجھا گیا لیکن ڈاکٹروں کی تشخیص کے بعد معلوم ہوا کہ انہیں جگر کا سرطان ہے۔ اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں ان کی حالت روز بروز بگڑتی گئی، جگر کے سرطان کی اذیت جھیلتے جھیلتے بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئے تھے بالآخر 4 مئی 1963ء کو شوکت تھانوی لاہور کے ایک اسپتال میں انتقال کر گئے، ان کی آخری آرام گاہ لاہور کے میاں میر قبرستان میں ایک چبوترے پر واقع ہے جس کے کتبے پر یہ عبارت درج ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

شہنشاہِ ظرافت، ادیب وصحافی

محمد عمر شوکت تھانوی تمغۂ امتیاز

بعمر 59 سال، 4/مئی 1963ء مطابق 9 ذی الحجہ 1382 ہجری کو
لاہور میں رحلت فرما گئے۔

انتقال سے ایک دن قبل بھی شوکت کا ذہن کس قدر متحرک تھا، ان کا یہ آخری شعر اس کی شہادت بنا ہوا ہے۔:

صبح ہوتی ہے تو آتی ہے مجھے رات کی یاد
رات آتی ہے تو اِک تازہ بلا ہوتی ہے

بظاہر وہ رات اس صاحبِ شان اور ظریفانہ شوکت کے حامل شخص کو ہماری نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل کر گئی مگر ہمارے ذہن میں محمد طفیل کا یہ جملہ اب تک گونج رہا ہے:

> "...... آپ ان لوگوں کے بارے میں سوچیں جو دفن ہونے سے پہلے مر جاتے ہیں اور ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو دفن ہونے کے بعد بھی نہیں مرتے۔"

بے شک وہ رات محمد عمر کے جسد کو لے گئی مگر شوکت تو اپنی فکروفن کی شان کے ساتھ اب بھی اپنی ظرافت میں سانسیں لے رہے ہیں اور مستزاد کہ یہ ظرافت تو آج دوسروں کے لیے بھی ایک آکسیجن کا کام کر رہی ہے۔ بقول حضرتِ انجم فوقی بدایونی:

موت تو ہم سے ہار چکی ہے

"قاعدہ بے قاعدہ" اولاً اُردو بک اسٹال لاہور سے جنوری 1950ء میں شائع ہوئی تھی۔ زیرِ نظر کتاب اسی اوّلین نسخے کے متن پر مبنی ہے۔ اس کے ساتھ ہی شوکت تھانوی کی بعض تحریریں اور ان کی شخصیت پر لکھے گئے مضامین بھی جو مختلف رسائل میں بکھرے پڑے

تھے، کتاب میں شامل کر لیے گئے ہیں۔

امید ہے یہ مجموعہ قارئین کی دل چسپی کا سبب ہوگا۔

مشتاق اعظمی

(وظیفہ یاب ریڈر و صدر شعبۂ اُردو
ٹی۔ ڈی۔ بی کالج، رانی گنج۔ مغربی بنگال)

رابطہ:

Dr. Mushtaque Azmi
"Azmi Mansion" 25, GC Mitra Road,
Kishori Gali, Asansol (W.B) 713301

Mob.: 9002140625

استفادہ: نقوش، لاہور (شوکت تھانوی نمبر) کتاب، لکھنؤ (شوکت نمبر)
اخبار "جنگ" کراچی کے تراشے اور کچھ دیگر رسائل و کتب۔

پس نوشت: غالباً کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جنوری ۱۹۴۳ میں تسیم انہونوی نے "شباب" کے نام سے ایک ادبی جریدے کا اجرا کیا تھا۔ اس کے سرورق پر مدیر کی حیثیت سے شوکت تھانوی کا نام ہوا کرتا تھا۔ اس کے چار شمارے لکھنؤ میں میرے ایک عزیز کے پاس محفوظ ہیں۔ اپریل 1943ء کے سرورق اور فہرست مندرجات کا عکس شامل اشاعت ہے۔

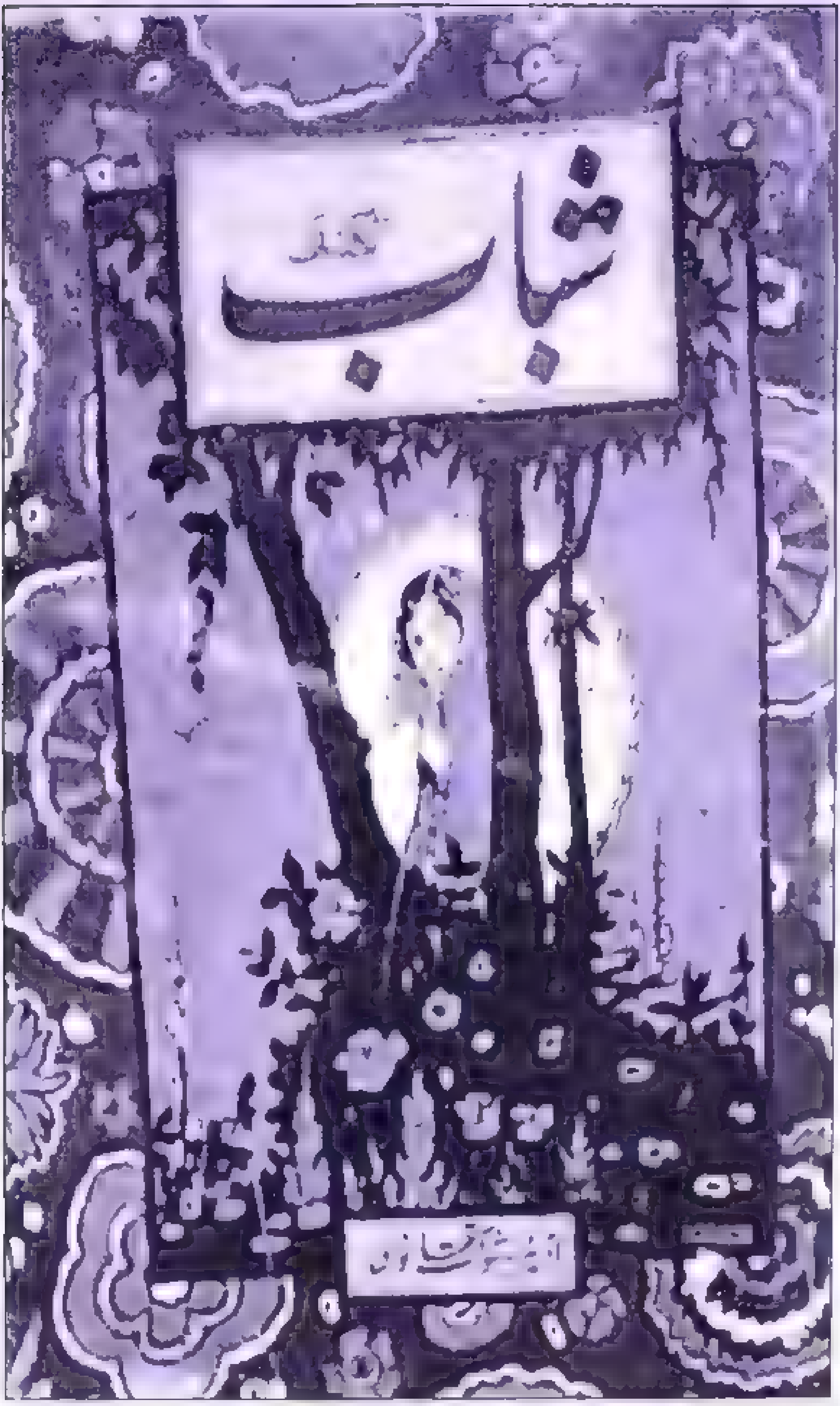
شباب
ایڈیٹر شوکت تھانوی

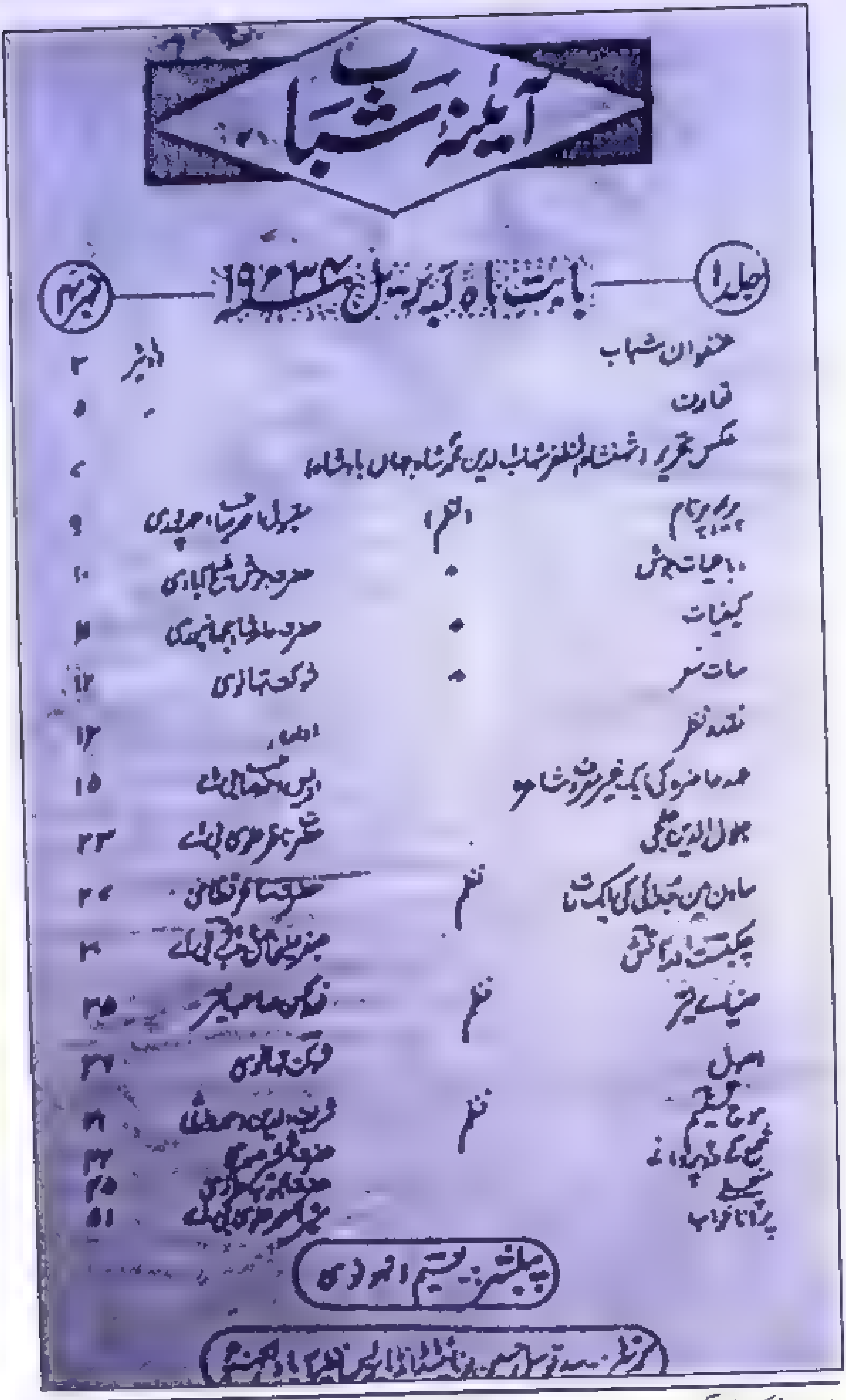

آئینۂ شباب

جلد ۱ — بابت ماہ اپریل ۱۹۳۶ء — نمبر ۴

عنوان شباب — ایڈیٹر — ۳
تعارف — " — ۵
عکس تحریر شہنشاہ ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ — ۷
پیام — نظم — [illegible] — ۹
رباعیات جوش — " — حضرت جوش ملیح آبادی — ۱۰
کیفیات — " — [illegible] — ۱۱
سات شعر — " — [illegible] — ۱۲
نقد و نظر — ادارہ — ۱۳
عہد حاضر کی ایک غیر معروف شاعرہ — [illegible] — ۱۵
[illegible] — [illegible] — ۲۳
ساون میں جنگل کی ایک شام — نظم — حضرت ساغر نظامی — ۲۷
چکبست اور داغ — [illegible] — ۳۰
[illegible] — نظم — [illegible] — ۳۵
اپیل — [illegible] — ۳۷
[illegible] — نظم — [illegible] — ۳۹
[illegible] — [illegible] — ۴۲
[illegible] — [illegible] — ۴۵
[illegible] — [illegible] — ۵۱

پبلشر: [illegible]

[illegible]

قاعدہ
بے
قاعدہ

شوکت تھانوی

ابتدائیہ

اس بے قاعدہ کو اپنی طرف سے بڑے قاعدے کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے باوجود اسباق بے قاعدہ ہو گئے۔

یہ قاعدہ آج سے ڈیڑھ برس پہلے لکھا گیا تھا۔ اُس وقت حرفوں کی زد میں آنے والے تمام ادیب زندہ تھے۔ آج جب یہ قاعدہ چھپ کر بازار میں آرہا ہے تو ان میں سے منٹو اور یگانہ اللہ کو پیارے ہو کر بھی زندہ ہیں۔ میراجی کو بھی تھوڑی رعایت کے ساتھ زندوں میں شمار کر لیجیے۔ شوکت تھانوی صاحب کی یہ کوشش تھی کہ اس قاعدہ میں صرف زندہ ادیبوں کا ذکر آئے۔ مگر وہ اپنی کوشش میں پورے کامیاب نہیں ہوئے۔ ان میں بعض زندہ ادیب مرے ہوئے بھی ہیں۔ مثال کے طور پر راقم الحروف اور اس کے ساتھی وغیرہ وغیرہ۔

اس قاعدہ میں واقعات کی غلطی بھی کھٹکے گی۔ اس میں مصنف کا کوئی قصور نہیں۔ جب دنیا ہی کے حالات ہر لحظہ بدلتے ہوں تو اہل قلم کے حالات جوں کے توں کیسے رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ جو ادیب آج سے پہلے باکار تھا، آج بے کار ہو چکا ہے یا جو آج باکار ہے وہ پہلے بے کار تھا۔ کچھ کے مشغلے بھی بدلے اور منصب بھی، جیسے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم آج سے پہلے گورنمنٹ کالج میں اردو پڑھاتے تھے، آج خود فکرِ معاشش کا درس لے رہے ہیں۔ پطرس اب سے پہلے پاکستان کے یو۔ این۔ او میں نمائندہ تھے، آج وہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کا دورہ کرنے آتے ہیں — اپنے تمام تغیر و تبدل کے باوجود اس قاعدہ کی ہمہ گیری اور افادیت میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

یہ قاعدہ پختہ عمر کے بچوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے شعور بالغ ہو گا۔

محمد طفیل

عرضِ مصنف

یہ ادبی قاعدہ، بے ادبی معاف، لاکھ بے قاعدہ سہی مگر وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے "حسبِ حال" ضرور ہے۔ زمانہ بدل کر کچھ کا کچھ ہو چکا ہے، مگر ہماری تعلیم کا سنگِ بنیاد یعنی ہمارا قاعدہ آج بھی وہی ہے جو ہمارے آبا و اجداد کے زمانے میں تھا۔ حالاں کہ وہ زمانہ دوسرا تھا اُس وقت پڑھنا زیادہ ضروری تھا اور آج پڑھنا اتنا ضروری نہیں جتنا لکھنا ضروری ہے۔ یہ بے شمار ادبی رسالے اور ان رسالوں میں لکھنے والوں کا ٹڈی دل اس بات کا ثبوت ہیں کہ ادب کا پیٹ صرف علم سے نہیں بلکہ جہل سے بھی بھرا جا سکتا ہے اور ہمارا موجودہ ادب جو آج خدا کے فضل و کرم سے اس قدر فروغ پر ہے کہ اس کے لیے برتھ کنٹرول کی صورت میں پیپر کنٹرول کی ضرورت محسوس ہوئی ہے یقیناً سسک سسک کر دم توڑ دیتا اگر قید صرف یہ ہوتی کہ صرف پڑھے ہوئے لوگ لکھیں۔ نہ اس قسم کے لوگ ملتے، نہ رسالوں کا پیٹ بھرتا اور نہ یہ رسالے ہمارے ادب میں یہ چہل پہل پیدا کرتے۔ وہ تو کہیے کہ خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ ادیب اور شاعر بننے کی لیے صرف تمیز الرحمٰن ہونا کافی سمجھا گیا اور ہر خدا کے بندے کو یہ پیدائشی حق حاصل رہا کہ وہ خواہ کچھ اور بن سکے یا نہ بن سکے مگر شاعر اور ادیب تو جب چاہے بن سکتا ہے۔ نہ اس کے لیے کسی سند کی ضرورت ہے نہ کسی لائسنس کی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے فنونِ لطیفہ میں سے ہمارا ادب جس قدر لطیفہ بنتا ہے اور کوئی فن اس سیلابی کیفیت میں مبتلا نہ ہوا۔ خیر

14602

کچھ بھی ہو مگر اس کے بدولت اُردو زندہ ضرور رہی خواہ در گور رہ کر زندہ رہی ہو۔

تجربہ سے ثابت ہوا کہ اُردو کو اگر واقعی آئندہ بھی زندہ رکھنا ہے تو اسی قسم کی زبردستی کرنا پڑے گی۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ ہم صحیح قسم کے پڑھے لکھے لوگ پیدا کرنا شروع کر دیں۔ کسی زبان اور کسی ادب میں اتنے پڑھے لکھے لوگ ممکن ہی نہیں جتنے اُردو کو یا یوں کہیے کہ اُردو کے ادبی رسالوں کو درکار ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہم کو پڑھے نہیں بلکہ صرف لکھے ہوئے لوگوں پر قناعت کرنا پڑے گی اور یہی ہمارے ادیب، ہمارے شاعر، ہمارے ادب کے علم بردار اور ہماری زبان کے سرپرست بن کر اردو کو مار مار کر زندہ رکھیں گے یعنی اُردو کو مرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

آپ حیران نہ ہوں اور صرف ”لکھے لوگ“ کی ترکیب سے اتنے اجنبی بننے کی کوشش نہ کیجیے۔ یہ آپ کے ادب اور آپ کی شاعری کے محسن ہیں جو اس وقت کام آئے جب آپ کی اُردو، یہ بے ماں کی بچی موت کے منہ میں جا چکی تھی۔ ایک مہذب اور متمدن خاتون کے مرنے کے بعد اس کی بچی کو ایک انا کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور یہ احتیاطیں سامنے نہیں ہوتیں کہ یہ انا کون ہے، کیا ہے۔ خواہ وہ گنوار ہو۔ پست اقوام میں سے ہو۔ بدصورت اور گھناؤنی ہو مگر چوں کہ اُسی کا دودھ پی کر یہ بچی زندہ رہ سکتی ہے لہٰذا وہ اسی کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ اُردو بھی ایک ایسی ہی بچی ہے، اس کی والدہ کا انتقال پر ملال ہو چکا ہے اور اب وہ اپنی انا کی گود میں پل رہی ہے۔ اُردو کی یہ انا یہ ”پڑھے لوگ“ ہیں جو جلدی میں تھوڑا بہت پڑھ کر اب اطمینان سے بیٹھے لکھ رہے ہیں اور ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ تم کیا لکھ رہے ہو اور کیوں لکھ رہے ہو۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ ہمارے یہاں ”پڑھے لوگ“ اوّل تو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے اور جب وہ پیدا ہو جاتے ہیں اور پڑھ جاتے ہیں تو ان کی بلا کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ اردو کی خدمت کریں اور اس اُردو کی جو خود اپنے وطن میں مہاجرانہ زندگی بسر کر رہی ہے، وہ زندہ زبانوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور مادری

زبان کو گھر کی کھیتی سمجھ کر اُجڑنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اُردو کو اپنا محسن ان ہی کو سمجھنا پڑے گا جو ''پڑھے لکھے'' نہیں بلکہ صرف ''لکھے لوگ'' ہیں۔

یہ ''لکھے لوگ'' دراصل پیدائشی ادیب اور شاعر ہوتے ہیں اور ان کا سہارا صرف یہ مقولہ ہے کہ ادیب یا شاعر بنتا نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ اس سے تو یقیناً انکار نہیں کر سکتے کہ یہ پیدا ہوئے ہیں اور چوں کہ یہ پیدا ہو چکے ہیں لہٰذا ان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ یہ ادب کی خدمت نہ کریں۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جو اسی خدمت کے جوش میں مکتبوں سے بھاگے ہیں۔ بہت سے وہ ہیں جو اسی ولولے سے مجبور ہو کر تعلیم کی تکمیل کا انتظار نہ کر سکے اور زیادہ تعداد ان بے گناہوں کی ہے جو ایمان داری کے ساتھ ادب کی خدمت کرنا نہ چاہتے تھے بلکہ زندگی کے لیے کسی اور سہارے کی تلاش میں تھے۔ ان بے چاروں نے دفتروں کے چکر لگائے۔ مختلف تجارتی دھندے آزمائے۔ سعی اور سفارش کا کوئی امکان باقی نہ چھوڑا۔ 'ضرورت ہے' کے اشتہار اور شاعر بننا ہی پڑا بے چاروں کو۔ یہی ان کے بس کا ایک دھندا تھا جس میں وہ لگ گئے اور آپ جانتے ہیں کہ جو ایک مرتبہ شاعر یا ادیب بن گیا پھر وہ دنیا کے کسی کام کا نہیں رہتا، کرے تو کیا کرے؟ آپ خود ہی بتایئے کہ اگر مشاعروں کے پلیٹ فارم اتنے مرنجاں مرنج نہ ہوتے جتنے وہ نظر آتے ہیں تو ریلوے پلیٹ فارم کے علاوہ یہ بے چارے اور کسی پلیٹ فارم پر پہنچ سکتے تھے۔ اتنی آسانی سے کسی اور فن کار اس قدر نہیں چل سکتا جس قدر یہ ''شعر بنانے والے'' صناع اچھل جاتے ہیں۔ ایسی سستی شہرت اور کہاں حاصل ہو سکتی ہے۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ یہ سچ ہے کہ بظاہر یہ مشغلہ ذریعۂ معاش نہیں مگر شغلِ بے کاری تو ہے اور اگر قسمت ساتھ دے جائے تو روزی کو حیلہ تو چاہیے وہ شعر و شاعری کا حیلہ بھی ہو سکتا ہے۔

ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے اب یہ روز بروز طے ہوتا جا رہا ہے کہ اس دور میں پڑھنا اتنا ضروری نہیں جتنا لکھنا ضروری ہے اور چوں کہ کچھ نہ کچھ لکھ سکنے کے لیے اُردو کی ایک آدھ کتاب پڑھنا بھی ضروری ہے لہٰذا ہمیں ضرورت ہے اب ایسے قاعدے اور ایسی پہلی

دوسری کتاب کی جو صرف اتنا پڑھا سکے کہ طالب علم بس لکھنا شروع کر دے پھر تو اللہ مالک ہے۔ املا وغیرہ کی غلطیاں لکھتے رہنے سے خود بخود یا تو رائج ہو جائیں گی ورنہ دور ہو جائیں گی۔ تذکیر و تانیث کے جھگڑے یوں بھی مختلف فیہ ہیں اور مستقل طور پر فساد کی جڑ اس طرح یا تو مستقلاً مختلف فیہ ہو جائیں گے ورنہ یہ اختلاف ہی ختم ہو جائے گا۔ آخر بغیر تذکیر و تانیث کے بھی اکثر زبانیں زندہ رہتی ہیں۔ مطلب تو یہ ہے کہ کسی طرح اُردو زندہ رہے۔ اُردو کے سلسلے میں بار بار اُن خان صاحب کی مثال سامنے آ رہی ہے کہ خدا نے بڑھاپے میں ایک اولادِ نرینہ عطا فرمائی تو اس نے ہوش سنبھالتے ہی مرنا شروع کیا حسینوں پر، اور جب محلے والوں کی شکایتیں آنا شروع ہوئیں کہ خان صاحب آپ کے صاحب زادے بدمعاشی پر اتر آئے ہیں تو خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اس باپ کو بڑے خلوص سے کہا کہ صاحب میں تو صرف اُس کی زندگی چاہتا ہوں، وہ بدمعاش ہو کر ہی جی جائے تو بہت ہے۔ اُردو کے متعلق بھی اس غور و فکر کا زمانہ اب نہیں رہا کہ وہ کیا تھی اور کیا ہو گئی ہے شکر ادا کیجیے اگر وہ زندہ ہی رہ جائے اور دیکھ لیجیے گا اس کو اگر زندہ رکھیں گے تو یہی ''لکھے لوگ'' یہی اُردو کے رسائل کا پیٹ بھرنے والے، یہی مشاعروں میں اپنے تخلص لے کر شرکت کرنے والے یہی خودرو ادیب اور یہی خود ساختہ شاعر۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ادیب اور یہ شاعر بنتے کیسے ہیں؟ اس تفصیل کا اجمال تو صرف یہ ہے کہ بس بن جاتے ہیں۔ مگر میرا اجمال شاید باعثِ تسکین نہ ہو:

شاید تری سمجھ میں رودادِ غم نہ آئے
ڈرتا ہوں آرزو کی تشریح مختصر سے

اس لیے تفصیل میں جانا ہی پڑے گا۔ سیاسی اعتبار سے نام اُسی وقت چل سکتا ہے جب لیڈری کے درجہ تک پہنچتے پہنچتے آدمی خاصہ لنڈورا بن سکتا ہے۔ بیوی اس کی زندگی ہی میں اپنے کو بیوہ سمجھ کر صبر کر لیتی ہے۔ بچے یتیم خانے میں داخل ہو چکے ہیں اور خود یہ حضرت ہر طرف سے بے نیاز ہو کر صرف سیاست کے نیازمند باقی رہ جاتے ہیں۔ آدھی زندگی جیل میں

اور آدھی جیل کی تمنا میں بسر کر چکتے ہیں۔ اسی طرح نام ور طبیب، نام ور پہلوان، نام ور وکیل اور ہر طرح کا نام ور ہونے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا بھی پڑتا ہے۔ صرف یہ آسانی من جانب اللہ ادب اور شعر کو حاصل ہے کہ ایک غزل پڑھ کر اور مشاعرے کے سامعین کو اپنی خوش الحانی سے بے وقوف بنا کر ایک آدمی شاعر مشہور ہو سکتا ہے، ایک مضمون لکھ کر اور مضمون کے ساتھ ایک تصویر چھپوا کر آدمی مضمون نگار بن جاتا ہے۔ اس آسانی سے اگر کوئی فائدہ نہ اٹھائے تو یہ کفرانِ نعمت کے سوا اور کیا ہے۔

یہ ادیب اور شاعر جب رسالوں میں ادیبوں اور شاعروں کو حضرت اور مولانا لکھا ہوا دیکھتے ہیں تو خود بھی حضرت اور مولانا بننے کو جی چاہتا ہے۔ یہ ادیب اور شاعر جب مشاعروں میں دیکھتے ہیں کہ ایک واجبی سا آدمی اسٹیج پر گیا اور داد کے خزانے لوٹ لیا تو ان کو بھی ایک تخلص کی جستجو ہوتی ہے اور اگلے مشاعرے میں وہ بھی ایک تخلص لے کر شرکت کرتے ہیں اور داد پا کر ان کو احساس ہوتا ہے کہ ہم خواہ مخواہ اب تک گم نامی میں پڑے رہے۔ ان ادیبوں اور شاعروں کو ادیب اور شاعر بننے کا شوق اُن ادیبوں اور شاعروں کی شہرت سے کچھ اور بھی زیادہ ہوتا ہے جو بے شمار پاپڑ بیل کر اس شہرت کے مستحق ہوئے ہیں۔ چنان چہ وہ ان کے چربے اُتارتے ہیں۔ ان کے نقوشِ قدم ڈھونڈتے ہیں اور ان ہی کے راستوں سے اُن تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسی قسم کے چند مشہور ادیب اور شاعر اس قاعدے میں جمع کر دیے گئے ہیں تاکہ اُن کے متعلق تازہ واردانِ بساطِ ادب و شعر کو ابتدائی معلومات حاصل ہو جائیں۔ یہ تازہ وارد الف سے انڈا نہیں چاہتے، وہ تو امتیاز علی تاج کی طرح انارکلی کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہونا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ان کو الف سے امتیاز علی تاج ہی کیوں نہ پڑھایا جائے تاکہ صرف یہ قاعدہ پڑھ کر وہ براہِ راست امتیاز علی تاج بننے کی کوشش شروع کر دیں۔ یعنی امتیاز علی تاج اپنی کوشش سے امتیاز علی تاج بنے ہیں تو وہ بغیر کسی کوشش کے امتیاز علی تاج بن جائیں۔

یہ قاعدہ جس قدر بے قاعدہ ہے اسی قدر براہِ راست ہے۔ تعلیم کا مقصد جب تعلیم تھا

وہ دور گزر چکا اب تعلیم کا مقصد وہ ہے جو اس قاعدے سے حاصل ہوگا۔ اس قاعدے میں جن ادیبوں اور شاعروں کا ذکر ہے ان کی شہرت کو رشک سے دیکھنے والے یہی تو چاہتے ہیں کہ وہ خود بھی اُن ہی جیسے بن جائیں چنانچہ ابتدا ہی میں اُن سے تعارف کرا دینا ضروری سمجھا گیا۔

اس قاعدے کو محکمۂ تعلیم منظور کرے یا نہ کرے مگر یہ قاعدہ منظورِ نظر ضرور بن کر رہے گا اس لیے کہ یہ بڑی مقصدی چیز ہے۔ محکمۂ تعلیم کا مقصد تو کلرک سازی ہے مگر یہ قاعدہ اُردو کے محافظ، اُردو کے مسیحا اور اُردو کے وہ محسن پیدا کرے گا جو اردو کو اگر مار بھی ڈالیں تو بھی ادبِ اُردو کو زندہ رکھیں گے، ان شاء اللہ۔

شوکت تھانوی

الف

امتیاز علی تاج

الف

امتیاز علی تاج

دیکھو بچو! یہ امتیاز علی تاج ہیں۔

امتیاز علی ان کا نام ہے اور تاج تخلص۔ مگر شعر نہیں کہتے تا کہ تخلص خرچ نہ ہو جائے اور تخلص اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ دنیا کا کیا بھروسہ جانے کب شعر کہنا پڑ جائیں۔

پہلے یہ ڈرامے پڑھتے تھے، پھر ڈرامے لکھنے لگے۔ جب لاہور میں ریڈیو ایجاد ہوا تو ڈرامے سنانے لگے اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ لاہور میں فلم کمپنیاں بھی اُگنے لگیں تو تاج صاحب ڈرامے دکھانے بھی لگے۔ اب ڈرامے کھلانا اور ڈرامے پلانا باقی رہ گیا ہے مگر لاہور ترقی کر رہا ہے اور سائنس بھی۔ وہ بھی آ ہی جائیں گے۔

امتیاز علی تاج کو اپنے ابا جان سے پوچھو۔ ممکن ہے وہ بھی بچہ رہے ہوں اور امتیاز علی تاج کا اخبار ''پھول'' پڑھا ہو بچوں کا یہ اخبار پڑھ پڑھ کر بہت سے بچے والدین بن چکے ہیں اور امتیاز علی تاج کو جانتے ہیں۔ تم کو بھی والدین بننا ہے۔ اس لیے تم بھی ان کو یاد رکھو۔

* * *

۔۔۔۔۔

بشیر احمد (میاں)

ب

بشیر احمد (میاں)

بچو! بشیر احمد اپنے کو میاں بشیر احمد کہتے ہیں اور واقعی بڑے میاں لوگ ہیں۔ میاں بشیر احمد، بیوی بشیر احمد اور بچے بشیر احمد سب ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں۔

یہ وہی میاں بشیر احمد جن کا رسالہ "ہمایوں" تمہارے ابا جان کے پاس آیا کرتا تھا اور جن کا وی پی تمہاری امی نے واپس کر دیا تھا۔ جب تمہارے ابا جان نے وی پی وصول نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو تمہاری امی جان نے کہا کہ بچوں کو یہ شعر زبانی یاد ہو چکا ہے:

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

اس لیے اب اس رسالے کی ضرورت نہیں رہی۔

بچو! یہ شعر میاں بشیر احمد کے ابا جان کا ہے جن کا تخلص بھی وہی تھا جو اس رسالے کا تخلص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعر میاں بشیر احمد کو اپنے اشعار کا ابا جان معلوم ہوتا ہے۔ تم بھی اپنے ابا جان سے شعر کہلوایا کرو تاکہ تمہارے شعر یتیم خانے میں داخل نہ ہوں۔

بچو! یہ میاں بشیر احمد بیرسٹر ہیں۔ مگر پہلے ایڈیٹری کرتے تھے پھر سفیر بن کر ترکی چلے گئے تھے۔ بڑے آدمی ہیں مگر چھوٹے نظر آتے ہیں۔ بچوں کی طرح ہنستے ہیں اور بغیر ہنسے بات نہیں کر سکتے۔ جب کبھی تم کو ان کے صاف شفاف دانت نظر آ جائیں سمجھ لینا کہ ہنس رہے ہیں۔ ایسے ہنس مکھ بزرگ کو بھلانا نہیں ہمیشہ یاد رکھنا۔

⁂

پے

پطرس بخاری

پے

پطرس بخاری

بچو!

یہی ہیں پطرس۔

ان کا نام سید احمد شاہ بخاری ہے۔ پطرس کے نام سے وہ اُردو میں مضمون لکھا کرتے تھے۔ جن کو پڑھ پڑھ کر تمہارے ابا جان اکیلے میں ہنسا کرتے تھے اور تمہاری امی جن رو رو کر دعائیں مانگا کرتی تھیں کہ خدا تمہارے ابا جان کے دماغ کو ٹھکانے کرے۔ مگر جب تمہارے ابا جان نے وہ مضمون تمہاری امی جان کو سنائے تو وہ بھی اپنا دماغ ٹھکانے نہ رکھ سکیں۔

بچو!

یہ زندہ اُردو کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں مگر مزاح نگاری نہیں کرتے تاکہ لوگ ترسیں اور اُردو زبان خدانخواستہ اتنی ترقی نہ کر جائے کہ وہ انگریزی زبان بھی منہ دیکھتی رہ جائے جس کے وہ مانے ہوئے ادیب ہیں۔ وہ انگریزی اور اردو زبانوں سے پانی بھرواتے ہیں۔

'پانی بھروانا' ایک محاورہ ہے۔ مگر ڈرو نہیں یہ امتحان میں نہ آئے گا۔ اس لیے کہ تمہارے ممتحن کو خود اس کا مطلب معلوم نہیں۔

بچو!

پطرس کے مضامین بڑے ہو کر پڑھنا اور کوشش کرنا کہ نہ ہنسو۔ ان مضامین کو پڑھ کر تمہیں اپنی زبان اردو پر پیار بھی آئے گا اور فخر بھی ہو گا پطرس پر غصہ آئے گا کہ اتنا کم کیوں لکھا۔ مگر بچو وہ بے چارے مجبور تھے۔ پہلے وہ طالب علموں کو پڑھاتے رہے تا کہ وہ جاہل نہ رہیں۔ اگر تمہارے ابا جان ان کے کالج میں نہ پڑھتے تو آج تم بھی ان کے ساتھ آلو چھولے کا کاروبار کرنے پر مجبور ہوتے۔

بچو!

آج کل پطرس لیک سکسس میں رہتے ہیں جہاں اقوام متحدہ نے کشمیر کا اچار ڈالا ہے۔ اقوام متحدہ کے اس مذاق کے لیے پاکستان کا سب سے بڑا مزاح نگار وہاں بھیجا گیا ہے اور جو کچھ خدا دکھا رہا ہے۔

دیکھ رہا ہے تم ان باتوں میں نہ پڑو تم صرف یاد رکھو،

پ۔ پطرس!

* * *

ت

تبسّم (صوفی)

تے

تبسم (صوفی)

بچو! یہ بتاؤ یہ کون ہیں؟

یہ تبسم ہیں جن کو سب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کہتے ہیں۔ بچو! تبسم مسکراہٹ کو کہتے ہیں۔ یہ ہمیشہ مسکراتے رہتے ہیں اور جب نہیں مسکراتے تو ان کو دیکھنے والے مسکرا دیتے ہیں۔ بچو! چوں کہ یہ تبسم ہیں لہٰذا کبھی قہقہہ نہیں لگاتے، زور کی ہنسی آ جائے تو ہاتھ کے جھٹکوں سے تھرما میٹر کا پارہ اتارنے کے انداز سے قہقہہ بلند نہیں کرتے بلکہ قہقہے کا مفہوم پورا کر دیتے ہیں یا قہقہے کو جھٹک دیتے ہیں کہ مجھ تبسم کے پاس کیوں آیا۔

بچو! یہ کالج میں پروفیسر ہیں اور طالب علموں سے سر کھپانے کے بعد بھی اتنا دماغ اپنے لیے بچا لیتے ہیں کہ اکٹھی تین زبانوں کے شاعر ہیں، اردو، فارسی اور پنجابی تینوں زبانوں میں بہت عمدہ شعر کہتے ہیں اور تین زبانوں کا شاعر ہونے کے باوجود بہت اچھے آدمی ہیں۔ زندگی بھر صرف ایک شوق رہا دوست بنانا اور پھر ان سے دوستی نبھانا۔ اگر کوئی ان کا دشمن بھی ہے تو اس کا کوئی دوست نہیں ہو سکتا۔

شاعری میں حقے سے مشورہ فرماتے ہیں۔ حقہ نہ ملے تو سگریٹ سے تیمم بھی جائز

سمجھتے ہیں۔ یہ ان کے بھی شوقین ہیں اور چند باسلیقہ پان کھانے والوں میں سے ایک ہیں۔

بچو! یہ تبسم صاحب بیٹھے بیٹھے کھو جایا کرتے ہیں، جاگتے جاگتے سو جایا کرتے ہیں مگر اس سے کچھ اور نہ سمجھنا یہ صرف محویت ہوتی ہے۔ آخر بے چارے کیا کریں ایک انار اور سو بیمار والا مضمون ہے۔ تین زبانوں کی شاعری ان کی بیمار، کالج کے طالب علم ان کے بیمار، ہوسٹل کے رہنے والے ان کے بیمار، ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کھیلنے والے ان کے بیمار، تیراکی سیکھنے والے ان کے بیمار، پبلشران کے بیمار، ریڈیو ان کا بیمار اور یہ خود سب کو خوش رکھنے کی بیماری میں مبتلا اور اسی میں گم۔

بچو! ایسے مرنجاں مرنج لوگ پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں اس لیے اس آخری مرنجاں مرنج انسان کو یاد رکھنا۔

❖ ❖

ث

ثناءاللہ (میرا جی)

ثے

ثناءاللہ (میرا جی)

بچو! یہ ثناء اللہ بن کر پیدا ہوئے اور میرا جی بن کر مرے۔ اب اُن کو مرنے کے بعد زندہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور جب یہ زندہ تھے تو ان کے دوست ان کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے اس لیے کہ ہمارے دیس میں کوئی شخص بغیر مرے قابل قدر نہیں بن سکتا۔ آج کل یومِ میرا جی منایا جاتا ہے اور جب میرا جی ایک خیراتی اسپتال میں مر رہے تھے اُس وقت ان کے حلق میں پانی ٹپکانے والا کوئی نہ تھا۔ اب ان کے مجاور سب ہی ہیں۔ اگر وہ زندہ ہو جائیں تو یہی سب ان کو پھر مار ڈالیں گے اس لیے کہ ان کے بہی خواہ ہیں۔

بچو! یہ اپنے وقت کے اتنے ذہین آدمی تھے کہ ذہانت کو بعض لوگ جنون تک سمجھنے لگے تھے۔ بعض لوگ اس سمجھ کو ناسمجھی سمجھتے تھے اور بعض سمجھ داری مگر خود میرا جی بذات خود اسی مغالطے کا دوسرا نام تھے۔ یہ بہت بڑے دست کار نوجوان واقع ہوئے تھے۔ جوانوں کو لوٹنے کا شوق لے کر چلے تھے اور جوانی لٹا کر بیٹھ رہے۔

بچو! ان کے ہاتھ میں لوہے کے تین گولے دیکھ لو، مگر یہ نہ پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ وہ خود بھی

ان گولوں کو اس طرح لیے پھرتے تھے کہ:

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو بتائے نہ بنے

ان کے گلے کی موٹی موٹی مالائیں اور ان کے لمبے لمبے بال ان کو رشی ظاہر کرتے ہیں۔ جو لوگ ان کو دیکھ چکے ہیں وہ اگر آج بھی دیکھیں تو کن کھجورا بن کر کلبلانے لگتے ہیں۔ لہٰذا بچو! ان کا تصور اپنے ذہن میں نہ لاؤ صرف ان کا کلام پڑھو۔ اگر یہ کلام سمجھ میں آجائے تو دماغ کا علاج کراؤ اور اگر نہ سمجھ سکو تو اس دماغ کی قدر کرو یہ ضرور تمہارے کام آئے گا۔

مگر بچو! بحیثیت مجموعی میرا جی کو تمہارا ادب اور تمہارا خلوص بھلا نہیں سکتا۔ وہ زندگی بھر لوگوں کو اپنے سے نفرت پیدا کراتے رہے مگر جب وہ مر گئے تو ان سے نفرت کرنے والوں نے ان کی محبت میں مرنا شروع کر دیا۔ یہی تھا اس جادوگر کا جادو اور اس رشی کا سراپ۔

بچو! تم اس ادیب، اس شاعر، اس آدمی کو سمجھنے کی کوشش کرو جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔

* * *

جیم

جوش ملیح آبادی

جیم

جوش ملیح آبادی

دیکھو بچو! یہ جوش ملیح آبادی ہیں جو اپنی زندگی ہی میں اتنے بڑے شاعر بن گئے ہیں اور بن ہی نہیں گئے ہیں بلکہ مان بھی لیے گئے ہیں۔ شاعر تو جو کوئی بنتا ہے وہ اپنے نزدیک بڑا ہی بنتا ہے۔ مگر ہم کسی شاعر کو اس وقت تک بڑا نہیں مانتے جب تک اُسے مار نہ لیں۔

بچو! یاد رکھو کہ ہم اپنے فن کاروں کو پہلے مار ڈالتے ہیں پھر ان کو پوجتے ہیں اور ان کی بڑائی ان کے جیتے جی تسلیم نہیں کرتے۔ مگر جوش ملیح آبادی کو ان کی زندگی ہی میں ہم نے بڑا شاعر مان لیا ہے، لہٰذا اب ان کو مرنے کی ضرورت نہیں آؤ دعا کریں کہ وہ زندہ رہیں۔

بچو! ملیح آباد کے اس پٹھان اور ہندو پاکستان کے اس شاعر کی شاعری، کے تیور بھی پٹھانوں جیسے ہیں۔ یہ پٹھان شاعر خدا سے بھی اکڑتا ہے۔ اسی لیے اب قضا و قدر نے احتیاط شروع کر دی ہے کہ اگر کسی کو پٹھان بنا دیا ہے تو اُسے شاعر بنایا جائے۔

بچو! جوش ملیح آبادی وہ پرانے شاعر ہیں جن کو نیا بھی سمجھا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں بھوک کا اور ان کی زندگی میں پیاس کا اظہار نمایاں ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں جوش نے بھی بڑا جرأت مندانہ حصہ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز حکومت ان کو خان بہادر نہ بنا سکی اور اب بھارت سرکار نے ہمارے اچھے خاصے شاعر کو پدم بھوشن بنا کر رکھ دیا ہے۔ تم پدم بھوشن پر غور نہ کرو یہ سمجھ میں آنے والی چیز نہیں صرف یاد کرو۔

* * *

چ

چغتائی (عبدالرحمٰن)

بچے

چغتائی (عبدالرحمٰن)

دیکھو بچو! یہ چغتائی ہیں۔

ان کا پورا نام ہے عبدالرحمٰن چغتائی۔

بچو! یہ ”مصاعر“ ہیں۔ ”مصاعر“ کے معنی نہ اپنے اُستاد سے پوچھنا نہ اپنے ابا جان سے۔ ورنہ سب جاہل ثابت ہوں گے۔ ”مصاعر“ اُس مصور کو کہتے ہیں جو اپنی تصویروں کے ذریعے شاعری کرے۔ بچو! یہ چغتائی اپنی تصویروں کے ذریعے شاعری کرتے ہیں۔ ان کا شعر الفاظ میں نہیں خطوط میں ادا ہوتا ہے اور وہ بھی عام فہم شعر نہیں، غالب کا شعر۔

بچو! ان چغتائی صاحب نے مرقعِ چغتائی کے نام سے غالب کا کلام تصویروں میں چھپایا ہے اور جب سے غالب کا کلام ان تصویروں میں چھپا ہے اور بھی مشکل ہو گیا ہے۔ غالب کے کلام کی تو لوگوں نے شرح لکھ دی تھی مگر ان تصویروں کی شرح کون لکھے۔

بچو! خدا کا شکر ادا کرو کہ اتنا بڑا مصور تمہارے ملک میں اس نے پیدا کیا:

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے بنایا ہے چغتائی

مگر اس سے زیادہ شکر اس بات کا ادا کرو کہ چغتائی خدا نہ بن سکے۔ ورنہ ہم تم سب اُسی شکل وصورت کے ہوتے جیسی چغتائی کی تصویر میں ہوتی ہیں۔ یہ دنیا تو بہت رنگین ہوتی مگر ہم تم سب ایسے ہوتے کہ گدی تک ہماری ٹانگیں ہوتی ہیں ٹخنوں تک ہاتھ ہوتے اور ہاتھ سے کچھ ہی چھوٹی انگلیاں اور انگلیوں سے کچھ ہی چھوٹے ناخن۔ آنکھوں کی جگہ ایک شگاف نظر آتا البتہ ناک ایسی ضرور ہوتی جس سے ہم ایک دوسرے کو سونگھ سکتے۔

بچو! ان چغتائی صاحب کی تصویریں جس قدر پرکار ہوتی ہیں یہ خود اسی قدر سادہ ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی موٹی موٹی انگلیوں میں یہ خطوط بنانے کی لچک کیسے آ جاتی ہے۔

بچو! تم چغتائی کی تصویریں دیکھو اور یاد رکھو۔

❖ ❖

ے

حفیظ (ہوشیار پوری)

ے

حفیظ (ہوشیار پوری)

بچو! یہ حفیظ ہیں۔ جالندھری نہیں۔ ہوشیار پوری

حفیظ جالندھری کا سبق تعلیمِ بالغاں والے قاعدے میں آئے گا.... تم حفیظ ہوشیار پوری کا سبق پڑھو۔

بچو! یہ وہی حفیظ ہیں جن کی غزلیں تمہارے ابا جان بہت جھوم جھوم کر پڑھا کرتے ہیں اور جن کے متعلق ایک دن وہ اپنے ایک دوست سے کہہ رہے تھے کہ کون کہتا ہے کہ اُردو غزل گوئی مر گئی۔

بچو! یہ حفیظ ہوشیار پوری اردو کی زندہ شاعری کے بہت بڑے غزل گو شاعر ہیں اور یہ اُن چند شاعروں میں سے ایک ہیں جو مشاعروں میں گا کر غزل نہیں پڑھتے پھر بھی سننے والے مذاق نہیں اڑاتے بلکہ عزت اور قدر سے ان کا کلام سنتے ہیں اور رسالوں میں ان کا کلام ڈھونڈتے ہیں۔

تمہارے ابا جان نے ٹھیک کہا تھا کہ اُردو غزل مری نہیں، اس لیے کہ اول تو حفیظ کی غزلوں میں زندگی اور تازگی ہے دوسرے اگر غزل مر جاتی تو حفیظ تاریخِ وفات نظم لکھ چکے ہوتے۔

بچو! حفیظ ہوشیار پوری کو تاریخ نکالنے میں بڑا ملکہ ہے وہ بات بات پر برجستہ تاریخ نکال دیتے ہیں اور ایسی کہ واقعی الہام معلوم ہو۔

ایسا اچھا غزل گو، ایسا اچھا تاریخ نکالنے والا شاعر کیسے بن گیا؟ یہ بات نہ ہم سمجھے ہیں نہ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ حفیظ کا کلام پڑھو اور دعا کرو کہ وہ تمہاری تاریخ نہ نکال دیں۔ ان کو یاد رکھو۔ اگر بھولے تو وہ ضرور تمہاری تاریخ نکال دیں گے۔

⁂

خ

خدیجہ مستور

خ

خدیجہ مستور

بچو! ان کو دیکھو۔ یہ خدیجہ مستور ہیں۔

پہلے ان کی صحت کے لیے دعا کرو۔ بچوں کی دعا خدا جلد سنتا ہے۔

بچو! یہ وہی خدیجہ مستور ہیں جن کی کہانیاں تمہارے ابا جان اس وقت بھی پڑھتے ہیں جب چائے میں مکھی پڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ان کے افسانے تمہاری امی جان اس وقت بھی پڑھتی ہیں جب چولہے پر چڑھی ہوئی ہانڈی جل رہی ہوتی ہے۔

بچو! ان کی کہانیوں میں نہ افیون ہوتی ہے نہ تمہارے ابا جان خدانخواستہ افیون کے رسیا ہیں مگر لطف اتنا ہوتا ہے کہ شروع کرنے کے بعد جب تک ختم نہ ہو باقی سب کچھ ختم کرنا پڑتا ہے۔

یہ کہانیاں اُسی زبان میں لکھتی ہیں جس زبان میں ہمارے تمہارے گھروں میں آئے دن کہانیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ مگر لکھی نہیں جاتیں۔ ان کی گھریلو زبان میں چوں کہ ادب ہے لہذا ادبی زبان میں گھریلو پن پایا جاتا ہے۔

بچو! تم بھی کہانی لکھنا سیکھو مگر خبردار، خدیجہ مستور کی نقل نہ اُتارنا۔ خدیجہ مستور نے کسی کی نقل نہیں اُتاری، اپنے لیے خود ایک راستہ نکالا ہے، اپنا انداز خود ڈھالا ہے، اپنا اسلوب خود پیدا کیا ہے۔ ان کا اسلوب ان کی سگی بہن ہاجرہ مسرور کے اسلوب کا سگا بھائی معلوم ہوتا ہے اور بس۔

بچو! ہاجرہ مسرور کا ذکر بعد میں پڑھنا فی الحال خدیجہ مستور کی تصویر دیکھو کہ ان دھان پان خاتون نے کیسی بھاری بھرکم کہانیاں لکھی ہیں اور پھر یاد رکھو۔

❖ ❖

دال

دل محمد (خواجہ)

دال

دل محمد (خواجہ)

بچو! دل محمد روڈ کو تو جانتے ہو نا۔ یہ وہی خواجہ دل محمد ہیں۔ روڈ ان کا تخلص نہ سمجھ لینا۔ یہ تو ان کے نام کی سڑک ہے۔

بچو! ان دل محمد صاحب کو ضرور یاد رکھو اس لیے کہ یہ ریاضی کے ماہر بھی ہیں اور شاعر بھی۔ بچپن میں جو طالب علم ان کی حساب کی کتابیں پڑھتے ہیں، جوان ہو کر اُن ہی کو ان کا کلام علی الحساب سنا پڑتا ہے۔

یہ بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں۔ جب تمہارے ابا جان جیومیٹری پڑھا کرتے تھے اس وقت تمہارے دادا جان مرحوم ان کا کلام مشاعروں میں سنا کرتے تھے۔

بچو! دعا کرو جب تمہارے پوتے ان کی جیومیٹری پڑھیں اُس وقت تم ان کا کلام مشاعروں میں سنو۔

بچو! خواجہ دل محمد کے کلام سے اس طرح بے گانہ وار نہ گزرو جس طرح لوگ دل محمد روڈ سے گزر جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی بنائی ہوئی متعدد راہیں تمہارے سامنے ہیں۔ ایک وہ جو ان کی شاعری نے بنائی۔ دوسری وہ جو ان کی ریاضی نے سکھائی اور تیسری دل محمد روڈ۔ لہٰذا ان کو یاد رکھو۔

⁂

ذال

ذوالفقار بخاری

ذال

ذوالفقار بخاری

بچو! ان کو جانتے ہو: یہ ہیں سید ذوالفقار علی بخاری۔ لوگ انہیں چھوٹے بخاری کہتے ہیں۔ اس لیے کہ بڑے بخاری ان کے بڑے بھائی سید احمد بخاری ہیں جو پطرس کے نام سے مشہور ہیں۔

بچو!

تم ان بخاری صاحب کو کسی نہ کسی رنگ میں ضرور دیکھتے ہوگے۔ بمبئی کے بیبے خاں یا کراچی کے جمعہ خان جمعہ یا ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل بخاری۔ اگر اب بھی نہ پہچانے ہو تو استاد سے پوچھو۔ استاد کو معلوم نہ ہو تو استاد بدل دو۔ ورنہ جاہل رہ جاؤ گے۔

بچو!

یہ بخاری صاحب ان چند ذہینوں میں سے ایک ہیں جن کو ہر فن مولا کہا جا سکتا ہے۔ ذہین آدمی کی ہر بات میں اپج ہوتی ہے اور بخاری اپنی ہر اپج سے مقدم اپنی انفرادیت کو سمجھتے ہیں۔ وہ براڈ کاسٹر ہیں اور ایسے کہ مائیکروفون کو دیکھ کر ان کی حالت اس پہلوان کی سی ہو جاتی ہے جو اکھاڑے کی مٹی سے پھولنا شروع کرتا ہے۔ وہ اداکار ہیں اور ایسے کہ ہمارا اسٹیج زندہ ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن کی کیفیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک چلتی پھرتی دنیا ہیں۔

ایک طوفانی دنیا۔ سعی و عمل کا ایک نہ تھکنے والا حشر مجسم۔

بچو!

تم ان کو مشاعرے میں دیکھو تو صرف ان کا شعر تم کو یاد رہ جائے۔ ریڈیو پر ان کا پارٹ سنو تو اُسی پارٹ کی نقل کرو۔ ان کے لطیفے سنو تو ان کو اپنا بہترین دوست بنانے کی تمنا کرو۔

بچو!

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بخاری بنتے ہیں۔ مگر بن وہی سکتا ہے جس کو بگڑنا نہ آتا ہو۔ جو کچھ نہیں بن سکتے وہ یہی کہتے ہیں کہ بخاری بنتے بہت ہیں۔ یہ بات تم نہ کہنا اس لیے کہ تم اچھے بچے ہو۔ اچھے بچے حاسد نہیں محسود ہوتے ہیں۔

بچو! تم بخاری بننے کی کوشش کرو اور یاد رکھو۔

* *

رے

رشید احمد صدیقی

ر

رشید احمد صدیقی

یہ اردو کے بہت بڑے طنز نگار اور طنز نگاری پر خود ایک بہت بڑا طنز، اپنی تکالیف کا قدرت سے صرف یہی انتقام لے سکتے ہیں کہ زندگی سراپا کرب بن کر رہ گئی ہے تو یہ اس کرب سے بھی انبساط نچوڑ کر فاتحانہ ہنسی ہنستے ہیں اور دنیا کو ہنساتے ہیں۔ کس کو یقین آ سکتا ہے کہ جس کا ادب روح میں ایک سدا بہار شگفتگی پیدا کر دیتا ہے وہ خود ایک قدِ آدم زخم بن کر رہ گیا ہے۔ زندہ دلی تو در کنار زندگی ہی کے لالے ہمیشہ پڑے رہے مگر اس مریض کا صحت مند ادب اپنی شگفتگی کے اس معیار سے بھی نیچے نہ آ سکا جو اس مریض کی بھولی بسری صحت نے کبھی قائم کیا تھا۔

درد کی ٹیس پر مسکرا کر دوسروں کو ہنسانے والا کس دل گردے کا انسان ہو سکتا ہے، اب اس کا اندازہ کرنا ہو تو رشید احمد صدیقی کا ادب خواہ نہ پڑھو رشید احمد صدیقی کو ضرور پڑھ لو اور ان کی صحت کے لیے دعا کرو۔

بچو!

ہم کو ہنسانے والے خدا کی رحمت ہیں لہٰذا خدا سے کہو کہ ان پر بھی رحمت نازل کرے۔

بچو! یاد رکھو۔

◆ ◆

زے

زہرہ نگاہ

ز ے

زہرہ نگاہ

ابھی کچھ دن پہلے یہ خود بچی تھیں بلکہ اب بھی بچپن ان کے آس پاس ہی نظر آتا ہے۔

بچو! یہ وہی زہرہ نگاہ ہیں جن کا کلام ایک مشاعرے میں تمہاری امی جان نے سن کر خود بھی شعر کہنے کی کوشش کی تھی مگر تمہارے ابا جان ان کا کلام سن کر ہنس دیے تھے اور پھر ان کو سنجیدگی سے منع کیا تھا کہ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے اور ترنم کی کوشش تو ہرگز نہ کرنا ایسا ترنم نحس ہوتا ہے۔

بچو! زہرہ نگاہ پہلا ہی مشاعرہ پڑھ کر مشہور ہو گئیں۔ ان کا کلام بہت اچھا ہوتا ہے مگر کلام سے زیادہ ان کی آواز اچھی ہے۔ وہ اگر تمہاری امی جان کی ناموزوں غزل بھی اپنی آواز میں سنا دیں تو مشاعرہ لوٹ لائیں۔

بچو! مشاعرہ لوٹنا مشکل بات نہیں اس لیے کہ مشاعروں میں داد دینے والے سب کے سب سمجھ دار نہیں ہوتے۔ اگر سب سمجھ دار ہو جائیں تو خوش گوئی اور خوش گلوئی میں امتیاز ہونے لگے۔

مگر بچو! زہرہ نگاہ صرف خوش گلو نہیں خوش گو بھی ہیں۔ ان کے کلام میں ابھی بچپن ہے مگر بچے کے پیر پالنے میں نظر آ جاتے ہیں۔ ان کا مستقبل بہت شان دار ہے۔ مگر جب وہ پختہ کہنے لگیں گی تو سننے والے اس فیاضی سے داد نہ دیں گے۔

بچو! زہرہ نگاہ ایک شریف خاندان کی بیٹی ہیں اور شرافت ان کے ہر انداز سے برستی ہے۔ یہی شرافت، معصومیت اور سادگی تم اپنے میں بھی پیدا کرو اور یاد رکھو!

◆ ◆

سین

سعادت حسن منٹو

سین
سعادت حسن منٹو

بچو! ان کو دیکھو۔ یہ منٹو نہیں۔ منٹو پارک والے منٹو ہیں۔ سعادت حسن منٹو افسانہ نگار منٹو۔ وہ منٹو جو مقدمہ چلوانے کے لیے افسانہ لکھتے ہیں۔ افسانہ رسالے میں جاتا ہے اور یہ خود عدالت میں۔

بچو! یہ اپنے وقت کے سب سے بڑے افسانہ نگار مانے جاتے ہیں۔ ان کے آرٹ نے ان کو عروج پر پہنچایا ہے۔ مگر وہ خود اپنے عروج سے گھبرا کر بار بار پستی کی طرف آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا فن ان کو زندہ جاوید بنا چکا ہے مگر وہ خودکشی کی کوششوں میں دن رات مصروف نظر آتے ہیں۔

بچو! ان منٹو کے دوست ان کو صبر کر چکے ہیں مگر ان کو اپنے دشمن دوست نظر آنے لگے ہیں۔ اس الٹی سمجھ کے علاج کے لیے دماغی اسپتال میں بھی رہ چکے ہیں مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

بچو! اپنے ننھے ننھے ہاتھ اُٹھا کر ان کے لیے دعا کرو۔

بچو! یہ بہت اچھے آدمی تھے اور اب بھی بہت اچھے آدمی ہیں مگر ایک دن ایک بوتل سے انڈیل کر نہ جانے کیا پی گئے کہ پھر نہ سنبھلے۔ سنا ہے کہ آج کل وہی بوتل خود ان کو پی رہی ہے۔ اس بوتل کی موت کو وہ اپنی زندگی بنائے ہوئے ہیں۔ خدا اُن پر رحم کرے۔

بچو! خبردار، اس قسم کی بوتل کے پاس نہ جانا۔ ورنہ منٹو بن جاؤ گے۔ افسانہ نگار منٹو نہیں بلکہ اپنی زندگی پر بار منٹو۔

آؤ بچو ہم سب مل کر ایک مرتبہ پھر خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے افسانہ نگار منٹو کو پتلے منہ کی اس بوتل سے نکال دے جس میں وہ پھنس گیا ہے۔ بچو! منٹو کے لیے دعا کرنے کو یاد رکھو۔

❖❖

شین

شوکت تھانوی

شین

شوکت تھانوی

بچو! دیکھنا ذرا یہ شوکت تھانوی ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ یہ مزاح نگار ہیں، اگر تم کو ان کے اس خیال پر ہنسی آ گئی تو بھی یہ اس کو اپنی مزاح نگاری کی کرامت سمجھیں گے۔

بچو! یہ شاعر بھی ہیں۔ جب سنجیدہ کلام رو رو کر پڑھتے ہیں تو سننے والوں کو ہنسی آتی ہے۔ جب مزاحیہ کلام سناتے ہیں تو لوگ عبرت پکڑتے ہیں۔ حالاں کہ خود ان کو عبرت پکڑ لینا چاہیے۔

بچو! خدا کے لیے ان کو سمجھاؤ کہ یہ ترنم سے کلام سنانا چھوڑ دیں اور اگر شاعری ہی ترک کر دیں تو تم سب مل کر جشنِ نجات مناؤ۔ یہ بہت بدآواز ہیں مگر گا کر شعر سنانے سے باز نہیں آتے۔ دعا کرو ان کی آواز خود ان کے کان میں بھی پہنچ جایا کرے بلکہ اگر صرف ان ہی کے کان میں پہنچا کرے تو بہت اچھا ہے۔

بچو! ان کے مزاحیہ مضامین پڑھ کر اگر تم کو ہنسی نہ آئے تو اپنے کو سمجھ دار سمجھنا اور اگر ہنسی آ جائے تو کسی فقیر سے اپنے لیے تعویذ لکھوانے کی کوشش کرنا صرف پڑھنے کی کوشش کیے جاؤ تاکہ شوکت تھانوی بننے سے خدا تم کو محفوظ رکھے۔

بچو! جب تم بڑے ہو کر قانون ساز جلسوں کے ممبر بننا تو اس قسم کا قانون ضرور بنوانا کہ شوکت تھانوی قسم کے لوگ "محمد فاضل" بنے نہ پھریں۔ اس قسم کی جرأت کرنے والوں کے لیے عبرت انگیز سزائیں رکھوانا۔

بچو! بعض لوگ شوکت تھانوی کو مزاح نگار کہتے ہیں اور بعض لوگ طنز نگار اور اس قسم کے لوگ بہت کم ہیں جو طنز اور مزاح کا فرق سمجھ سکیں۔ فرق سمجھے ہوتے تو طنز نگار کہتے نہ مزاح نگار۔ خود ان کی ذات کو طنز اور مزاح کہتے۔ نگار کی ہمت نہ لگاتے۔

بچو! ان کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھو اور یاد رکھو۔

⁂

صواد

صلاح الدین احمد

صواد

صلاح الدین احمد

بچو! یہ صلاح الدین احمد ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد۔

تم اگر ان کو نہیں جانتے تو یہ تمہارا قصور ہے۔ ایسے شریف آدمی کو ضرور جاننا چاہیے۔ اگر تم اچھے بچے ہو تو اچھے آدمیوں سے ضرور ملو اور اچھے آدمیوں میں مولانا صلاح الدین احمد کا نام سرِ فہرست آنا چاہیے۔

بچو! مولانا صلاح الدین احمد ایک قسم کے اشرف المخلوقات ہیں۔ آدمی تو سب ہی ہوتے ہیں، مگر اتنی آدمیت بہت کم آدمیوں میں ہوتی ہے جتنی مولانا صلاح الدین میں ہے۔ وہ بہت ملنسار، مرنجاں مرنج اور بشاش آدمی ہیں۔ جن آدمیوں کے حالات میں بشاشت ہوتی ہے، وہ اگر بشاش ہیں تو ان کا کمال نہیں بلکہ حالات کی غلطی ہوتی ہے مگر مولانا صلاح الدین احمد کے حالات میں اتنی بشاشت نہیں جتنی ان کی ذات میں ہے، وہ انگریز مصنفین کی طرح کا سر اور سر کے بال لیے اپنی گھنی مونچھوں اور دوہرے جسم کے ساتھ اس قدر سادہ اور معصوم باتیں کرتے ہیں کہ ان کا مخاطب اپنے کو ان کا محبوب سمجھنے لگتا ہے اور اسی بات نے ان کو سب کا محبوب بنا دیا ہے۔

ان کو بیوی اور بچوں سے جو محبت ہونا چاہیے، وہ بھی اردو زبان سے ہے۔ اردو زبان کے متعلق جس وقت کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنی کسی محبوب کا ذکر مزے لے لے کر، کر رہے ہیں۔ ان کے لب و لہجہ کی مٹھاس اور آنکھوں کا معصوم سرور سننے والوں پر بھی وہ عشق طاری کر دیتا ہے جس میں وہ خود مبتلا ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد رسالہ 'ادبی دنیا' کے ایڈیٹر تھے۔ اگر 'ادبی دنیا' کے ایڈیٹر نہ بھی ہوتے تو ادبی دنیا ان سے بیگانہ نہ رہتی۔

ایسے معصوم بزرگ، ایسے ہنس مکھ رنجور اور ایسے مستند طالب علم اب کہاں ملتے ہیں۔ یہ مل گئے ہیں تو بچو ان کی قدر کرو اور یاد کرو ان کا نام۔

⁂

ضواد

ضیا جالندھری

ضواد

ضیا جالندھری

بچو! یہ وہی ضیا جالندھری ہیں جن کو ترقی پسند طبقہ ترقی پسند سمجھتا ہے۔ عورتیں ان کو کنوارا سمجھتی ہیں۔ دوست ان کی دوستی میں مبتلا ہیں اور یہ خود کسی مرض میں مبتلا نہیں خواہ وہ عشق ہی کیوں نہ ہو۔

پہلے ریڈیو میں تھے۔ پھر ڈاک خانے میں چلے گئے۔ آخری اطلاع یہ تھی کہ فوج میں ہیں۔ اللہ جانے اس بھٹکے راہی کی منزل کیا ہے اور اس کو منزل کی تلاش ہے بھی یا نہیں۔ پچھلے دنوں بہت سی منزلیں خود ان کا پتا پوچھ رہی تھیں۔ جب بتایا گیا کہ ڈاک خانے میں ہیں تو مایوس ہو کر بولیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیڈ لیٹر آفس میں بے نشان پہنچ گیا۔ اندیشہ ہے کہ اگر کچھ دن شادی نہ کی تو بے وارث مال کی حیثیت سے نیلام نہ کر دیے جائیں۔

شعر بہت کم کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اچھا کہنا چاہتے ہیں۔ کہہ کر مشاعروں میں سناتے اس طرح ہیں گویا سامعین کو گالی دے کر بھاگنے کا ارادہ ہے۔ اصرار پر دوسری نظم یا غزل اس طرح پڑھتے ہیں گویا گالی دے کر بھاگے تو تھے مگر پکڑے گئے اور اب صفائی پیش کر رہے ہیں۔ یہ مصرع ان کے لیے ہی ہو سکتا ہے:

شاعر تو اچھا ہے پر بدنام بہت ہے

سنا ہے کہ سینے میں ایک پر خلوص دل بھی رکھتے ہیں۔ مگر لبوں پر ہر وقت ایسا تبسم نظر آتا ہے گویا کہہ رہے ہیں کہ یہ دل عام افواہ کے خلاف میرے ہی پاس موجود ہے اور صرف تمہارے لیے ہے۔ لے لینا جواں ہو کر۔

ایک مسلسل طوفان.... ایک سدا بہار تہلکہ ایک مستقل ہنگامہ..... ایسی ہی ہنسی۔ ایسی ہی گفتگو اور ایسا ہی ہر انداز... کاش یہ کھلنڈرا کبھی کبھی ذمہ دار بھی بن جایا کرے۔

بچو! ان کا نام نہ بھولنا۔

❖ ❖

طوئے

طفیل (محمد طفیل)

طوئے

طفیل (محمد طفیل)

بچو!

وہی ہیں یہ نقوش کے دھان پان ایڈیٹر محمد طفیل۔

قاضی کیوں دبلے؟ شہر کے اندیشے سے۔ طفیل کیوں دبلے؟ ایڈیٹری کے چشے سے۔ بچو! یہ وہی نازک اندام ایڈیٹر ہیں جن کا رسالہ نقوش ہمیشہ موٹا تازہ تم نے دیکھا ہوگا۔ عام رسالے اپنا ایک آدھ خاص نمبر نکالا کرتے ہیں۔ مگر طفیل کا "نقوش" خاص طور پر بھی عام نمبر کی صورت سے نہیں نکلتا۔ اس کا ہر عام نمبر خاص ہوتا ہے اور یہی طفیل کی خاص ادا اور عام بے ساختگی ہے۔

صورت دیکھیے تو زیادہ سے زیادہ خود اپنے رسالے کی 'پرنٹ لائن' نظر آتے ہیں۔ سرگرمی دیکھیے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس ہڈیوں کے متناسب ڈھانچے میں اس بلا کی عملی صلاحیت کہاں سے آگئی۔ ہر کام میں سلیقہ اور تمیز داری نظر آتی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ طبیعت بلا کی نفاست پسند پائی ہے۔ آپ ان سے گفتگو کیجیے وہ اپنے دبلے سے لمبے چہرے پر ایک لطیف سی مسکراہٹ لیے بات سنتے رہیں گے اور کریں گے وہی جو ان کو کرنا ہوگا۔

ان کی ہنسی بہت مہلک ہوتی ہے جو غصے کے وقت بھی غائب نہیں ہوتی۔ کاروباری لین دین کے وقت بھی موجود رہتی ہے اور اہل معاملہ مار کھا جاتا ہے۔ یہی تبسم اور یہی نیاز مندانہ انداز بڑے بڑے سرکشوں سے پانی بھروا لیتا ہے۔

بچو!

یہ محمد طفیل جتنے ہنس مکھ اور سیدھے سادھے نظر آتے ہیں اتنے ہی کاروباری آدمی ہیں، مگر وہ کاروبار اس طرح کرتے ہیں کہ ان سے کاروبار کرنے والا سود و زیاں بھول جاتا ہے۔ یہ اگر اخلاق نہیں تو جادوگری ہے۔ بہر حال ہے کچھ اس قسم کی چیز جو ان کے کاروبار کا گر ہے جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ان کو ایک کامیاب ناشر اور ایڈیٹر کے علاوہ وہ چیز بھی بنا دیا ہے، جسے ادیب کہتے ہیں۔

بچو! یہ خدا بننے کے علاوہ سب کچھ بننے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بچو!

یہ طفیل دوست کی حیثیت سے بھی عمدہ آدمی ہیں کنپٹی پر دو چار بال سفید ضرور نظر آتے ہیں مگر چہرے پر اب تک اس صاحب اولاد کے بلا کی دوشیزگی برتی ہے اور باتوں میں وہ بھولپن ہوتا ہے کہ مصنف سے اس کی تصنیف یہ جو چاہیں مانگ لیں...

بچو! ان کو یاد رکھو۔

* * *

ظوۓ

ظفر علی خاں

ظوئے

ظفر علی خان

بچو! یہ وہی مولانا ظفر علی خان ہیں جن کے اخبار کا نام ''زمین دار'' ہے اور جس کا زمین داری سے کوئی تعلق نہیں۔

بچو! مولانا ظفر علی خاں ہمارے ان بزرگوں میں سے غالباً اب اکیلے ہی رہ گئے ہیں جن کے لیے ہم یہ دعا کر سکتے ہیں کہ خدا ان کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ تم کہو گے کہ ڈاکٹر عبدالحق بھی اس قسم کے بزرگ ہیں۔ اس کے جواب میں ہم کہیں گے شاباش!

بچو تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ جاؤ آج کی چھٹی۔

بچو! یہ مولانا ظفر علی خان ہماری زبان کی اخبار نویسی کے اگر باوا آدم نہیں تو بھی جد امجد کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔ جب ہمارے محسن معمر ہو جاتے ہیں تو ہم کو صرف ایک طریقہ یاد رہ گیا ہے کہ ہم ان کو ''بابا'' کا خطاب دے دیتے ہیں۔ جیسے قائداعظم کو ''بابائے ملت'' کہنے لگے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق کو ''بابائے اُردو'' کہتے ہیں۔ اس طرح مولانا ظفر علی خان کو ''بابائے صحافت'' کہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ صحافت یتیمی سے بچی رہے۔

بچو! تم کو معلوم نہیں کہ یہ مولانا ظفر علی خاں جتنے بڑے اخبار نویس ہیں اتنے ہی بڑے لیڈر بھی رہ چکے ہیں اور شاعری میں تو ان کی حیثیت شعر کہنے کی مشین کی سی تھی۔ موضوع یا مصرع طرح اس مشین میں ڈال دیجیے اور کھٹا کھٹ ایک سے ایک ڈھلا ہوا شعر نکلنا شروع ہو جائے گا اس مشین سے وہ شاعری کو اپنے بائیں ہاتھ کا اور صحافت کو اپنے داہنے ہاتھ کا کھیل زندگی بھر سمجھتے رہے۔

بہت دنوں سے وہ ضعیفی کے ہاتھوں بقول غالب ''نکمے'' بن کر رہ گئے ہیں مگر ان کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ زندہ رہیں۔ ان کی زندگی سے ہم کو اس طرح کا اطمینان حاصل رہے گا جیسے کسی طالب علم میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے کہ الماری میں ڈکشنری رکھی ہوئی ہے۔

بچو! ان کا نام یاد رکھو۔

◆ ◆

عین

عبدالحق

عین
عبدالحق

دیکھو بچو!

ان کو پہچاننے کی کوشش کرو۔ اگر تم ان کو بھی نہ پہچانے تو اُردو کے
گے؟ یہ بابائے اُردو مولانا عبدالحق ہیں۔ یہ ڈاکٹر بھی ہیں مگر علاج صرف اُردو کا

بچو!

یہ بابائے اُردو اس لیے نہیں ہیں کہ اُردو ان کی بیٹی ہے۔ البتہ جب اُردو یتیم ہوگئی تو مولوی عبدالحق نے اُردو کو گود لے لیا۔ کہلائے صرف بابائے اُردو — مگر سچ پوچھو تو اُردو کو ماں اور باپ دونوں بن کر پالا اور اُردو کے لیے اپنی زندگی تج دی۔ اب ان بے چارے کا سوائے اُردو کے اور کوئی نہیں ہے۔ اولاد ہے تو اُردو، دوست ہے تو اُردو، مونس ہے تو اُردو، غم گسار ہے تو اُردو، یہ اُردو ہی کے غم میں بوڑھے ہو گئے ہیں اور اگر آج اُردو کو پاکستان اپنا لے تو آج ہی یہ بوڑھا جوان ہو سکتا ہے۔

بچو!

یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ اُردو ان کے سہارے زندہ ہے یا یہ اُردو کے سہارے زندہ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں ٹھیک ہیں یہ صرف اُردو بولتے ہیں اور صرف اُردو سنا چاہتے ہیں اس ڈر سے کہ کہیں کسی اور زبان کی بھنک کان میں نہ پڑ جائے اپنے کان بند کر رکھے ہیں۔

بچو!

ان کی زندگی کے لیے دعا کرو۔ اس لیے کہ ان کی زندگی اُردو کی زندگی ہے یاد رکھو۔

❖❖

غین

غلام عباس

غین

غلام عباس

افسانہ نگار غلام عباس جن کو لوگ آنندی کے نام سے بھی جانتے ہیں۔

بچو!

یہ ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جو حقائق کو کہانی بنا کر گزر گئے ہیں۔ مگر بچو! تم تو خیر بچے ہو یہ بات تو ہم "والدین" قسم کے لوگوں کی سمجھ میں بھی نہ آئی۔ ایسا بے ڈھنگا آدمی جو سوائے کھُر پہ ہونے کے اور کچھ نظر نہیں آتا ایسے لطیف احساسات اور اُن احساسات کا ایسا نازک اسلوب ادا کہاں سے لے آتا ہے۔

بچو! تم غلام عباس سے ملنے کی کبھی کوشش نہ کرنا ورنہ حلف اٹھا کر تم کو یقین دلائیں گے کہ میں غلام عباس ہوں اور تم کو عبرت ہوگی کہ ذرا سی بات کے لیے یہ شخص جھوٹا حلف اُٹھا رہا ہے، مگر جب تم کو بمشکل ان کے غلام عباس ہونے پر یقین آجائے گا تو تم ان کو ایک نہایت پر خلوص دوست، ایک ایمان دار آدمی اور ایک سچا ادیب پاؤ گے۔

بچو! یہ غلام عباس بچوں کی طرح معصوم نظر آتے ہیں۔ ان کے قلم میں جو تاثیر ہے وہ خدا نے ان کے چہرے میں نہیں دی ہے۔ جب وہ اچانک لکھنا شروع کر دیتے ہیں تو خدا کی قدرت نظر آتی ہے کہ ہتھوڑا ایک دم قلم کیسے بن گیا۔ مگر وہ اپنی صورت سے زیادہ اپنی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ اس لیے تم کو یہ بزرگانہ مشورہ دیا جا رہا ہے کہ تم ان سے ان کے افسانوں میں ملو۔

بچو! تم ان غلام عباس کے اگر واقعی دوست بن جاؤ تو یہ سچ مچ کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ خلوص کی شدت میں اکثر یہ بے چارے حیران رہ جاتے ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں اور پھر بے کسی کے ساتھ ایسی ہنسی ہنستے ہیں جیسے کسی نے کیلا کھا کر قہقہہ بلند کیا ہو۔

بچو!

جب تم عاقل بالغ ہو جاؤ گے اس وقت تم کو اختیار ہے کہ غلام عباس سے ملو یا نہ ملو، فی الحال تم ان کا نام یاد رکھو۔

◆◆

۶

فراق گورکھپوری

فی

فراق گورکھپوری

بچو!

یہی ہیں وہ فراق گورکھپوری جن کی غزلیں باوجود اس قدر پسند ہونے کے اب تک قوالوں سے بچی ہوئی ہیں۔

بچو! فراق گورکھپوری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اُن چند غزل گو شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی قدامت پرستی کو ترقی پسند نہ جانے کیوں ترقی پسندی سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ فراق نہ قدامت پسند ہیں نہ ترقی پسند بلکہ اگر کچھ ہیں تو خود پسند اور خود پرست۔ مگر بچو خود پرست اور خود فریب میں بھی تو فرق ہوتا ہے۔

بچو! فراق گورکھپوری پروفیسر ہیں۔ مگر مشاعروں میں جس انداز سے اپنا کلام سناتے ہیں، شبہ یہی ہوتا ہے کہ یہ کسی کالج کے پروفیسر نہیں بلکہ شعبدہ باز پروفیسر ہیں اور ابھی اپنے شعر کے دوسرے مصرعے سے کبوتر نکال کر اڑا دیں گے۔ گول گول آنکھیں اس انداز سے گھما پھرا کر اپنے ہر مصرعے کے ہر لفظ کو باقاعدہ جمناسٹک کرا کے جس وقت وہ پڑھتے ہیں سننے والوں کو در پردہ ایک صدمہ سا ہوتا ہے کہ اتنا چھوٹا شعر ان پر کیوں نازل ہو گیا تھا۔ ان کے اشعار میں نغمے سے زیادہ رقص ہوتا ہے، مگر شرط یہی ہے کہ وہ خود نرت نہ فرمائیں۔

بچو! فراق گورکھپوری بڑے خوفناک قسم کے صاف گو آدمی ہیں۔ ایک رکھائی سے بعض تلخ باتیں کہہ جاتے ہیں کہ سننے والا حیران رہ جاتا ہے۔ تکلف ایسے منہ پھٹ آدمی سے خود پناہ مانگتا ہے۔ مگر ان کی باتیں سن کر یہ اعتماد ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس شخص کی کسی بات میں کسی غلط فہمی کا کوئی امکان نہیں۔

بچو! فراق گورکھپوری کے اشعار میں تم کو جتنی اردو ملے گی اتنی ہی ان سے مل کر ان کی گفتگو میں تم پاؤ گے۔ اپنے لب و لہجے کے اعتبار سے وہ ہر وقت گورکھپور میں رہتے ہیں اور جب گلاس اور بوتل سامنے آ جائے پھر تو وہ کہیں بھی نہیں رہتے۔

سنا ہے کہ کچھ دنوں سے صحت مسلسل خراب ہے۔ لہٰذا دعا کرو ان کے لیے اور یاد رکھو! ان کا نام۔

قاف

قاسمی (احمد ندیم قاسمی)

قاف

قاسمی (احمد ندیم قاسمی)

دیکھو بچو!

یہ احمد ندیم قاسمی ہیں۔

شاعر، افسانہ نگار، ادیب، صحافی، سب کچھ مگر سب سے بڑھ کر ایک اچھے آدمی۔

بچو!

اچھے شاعر، اچھے افسانہ نگار، اچھے ادیب اور اچھے صحافی تو پھر بھی مل جاتے ہیں مگر اچھا آدمی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش عام انسانوں کی پیدائش سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ اس کی پیدائش کے لیے نرگس کو ہزاروں سال اپنی بے نوری پر رونا پڑتا ہے۔ پھر ایسا آدمی پیدا ہوتا ہے۔

بچو!

تم احمد ندیم قاسمی کی قدر کرو۔ اگر تم نے اتنے اچھے آدمی کی قدر نہ کی تو اچھا آدمی پیدا ہونا بالکل بند ہو جائے گا خواہ نرگس اپنی بے نوری پر لاکھوں سال روتی رہے۔

بچو!

ان احمد ندیم قاسمی کا کوئی دشمن اگر تم دریافت کر سکو تو اس کی تصویر اخباروں میں چھپوا دینا تاکہ یہ دعویٰ باطل ہو سکے کہ احمد ندیم قاسمی نے خواہ دوست کم بنائے ہوں مگر دشمن کوئی

نہیں بنایا۔

بچو!

احمد ندیم قاسمی کی شرافتِ نفس کا یہ عالم ہے کہ ان کا خطاوار خود اپنی نظروں سے گر جاتا ہے اور پھر یہ خود ہی اس گرے ہوئے کو اٹھا کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیتے ہیں۔

بچو!

اگر تم سرسری طور پر احمد ندیم قاسمی سے ملے تو ان کے متعلق عجیب وغریب رائے قائم کرو گے۔ مثلاً نام بڑے اور درشن چھوٹے۔ بہت ممکن ہے کہ تم ان کو دیکھ کر مثنوی زہرِ عشق کا یہ مصرع پڑھنے لگو کہ:

ع "کم سخن ہائے میری غیرت دار"

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ وہ جتنے بڑے سخن گو اور سخن سنج ہیں اتنے ہی کم سخن بھی واقع ہوئے ہیں۔ غیرت داری کا عالم دیکھنا ہو تو عینک کے پیچھے مسکرانے والی آنکھیں دیکھ لو جو دو کنواری بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔

ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے یہ چہیتے بھیا ہیں اور خوش نصیب ہیں ہاجرہ اور خدیجہ کہ ان کو ایسا چاہنے والا بھائی پاکستان آ کر الاٹ ہو سکا۔

احمد ندیم قاسمی پر جب بہت پیار آتا ہے تو یہ غصہ بھی آنے لگتا ہے کہ یہ سیاسیات میں کیوں پڑ گئے۔ وہ خالص شاعر اور خالص ادیب پیدا ہوئے تھے مگر برا ہو اس دردمند دل کا جس نے ان کو سیاسی آدمی بھی بنا دیا اور شاعروں کو چھوڑ کر وہ جیل بھی جانے لگے۔

بچو!

سیاست چاہتی ہے کہ ادب سے ایک عظیم شخصیت چھین لے اگر تم دعا کرو کہ احمد ندیم قاسمی صرف ادیب اور صرف شاعر رہ جائیں۔ ان کا نام یاد رکھو۔

* *

کاف

کرشن چندر

کاف

کرشن چندر

بچو! یہ کرشن چندر ہیں۔ تم ہنس کیوں رہے ہو، واقعی یہ کرشن چندر ہیں۔ تم کو ہنسی اس بات پر آتی ہوگی کہ جس کرشن چندر کا نام اتنا ہو، وہ بھلا صرف اتنا سا کیسے ہو سکتا ہے۔ تم نے کرشن چندر کا تصور بہت بھاری بھرکم قائم کیا ہوگا مگر وہ تو واجبی سے آدمی نکلے۔ وجہ یہ کہ لکھتے زیادہ ہیں، ورزش کم کرتے ہیں۔

بچو! اگر تم کو نہیں معلوم تو حیرت ہے کہ کرشن چندر بہت بڑے افسانہ نگار ہیں ترقی پسند ان کو ترقی پسند سمجھتے ہیں۔ مگر جو ترقی پسند نہیں، وہ بھی پسند کرتے ہیں اور حیران ہوتے کہ ترقی پسند ان کو پسند کرتے ہیں جب کہ ان کے افسانوں میں جنسیات کی مقدار اتنی ہی ہوتی ہے جتنی دنیا کے دوسرے مسائل کی۔ صرف جنسیات ہی جنسیات نہیں۔

بچو! یہ کرشن چندر بھولی بھالی شکل کے نہایت سادہ آدمی نظر آتے ہیں۔ مگر اپنے افسانوں میں بڑے پرکار بھی بن جاتے ہیں۔ ان کے متین چہرے پر دو شرارت سے بھری ہوئی آنکھیں ہر وقت جزئیات کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ وہ پیش پا افتادہ مسائل سے بھی خاموشی کے ساتھ گزر نہیں جاتے بلکہ ان میں بھی اپنے لیے افسانہ ڈھونڈتے ہیں۔ وہ صرف ڈھونڈتے ہی نہیں بلکہ پاتے بھی ہیں۔

بچو! یہ کرشن چندر خطرناک حد تک بذلہ سنج بھی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ بہت گہرے آدمی بھی۔ وہ چپکے چپکے جانے کیا سوچتے رہتے ہیں۔ ان کی زندگی کچھ چیونٹی سے ملتی جلتی ہے جو چپکے چپکے جانے کیا کرتی رہتی ہے۔ مصروفیت بے حد مگر نہایت خاموش قسم کی مصروفیت۔ جب ریڈیو میں رہے اس وقت بھی نہایت خاموش کارکن رہے۔ جب ریڈیو سے فلم میں گئے اس وقت بھی چپ چاپ اور اس کے بعد بھی چپ۔ ان کی کتابیں، ان کے افسانے اور ان کی تحریریں شور مچاتی ہیں، ہنگامے برپا کرتی ہیں مگر وہ اس طرح معصوم بنے رہتے ہیں جیسے ان کا اس شور، اس ہنگامے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

بچو! یہ نہ سمجھنا کہ وہ گھنے ہیں وہ نہ گھنے ہیں نہ چھچھوں قہقہوں والے آدمی البتہ ان کو اپنے افسانوں کی اوٹ میں رہنے کا کچھ شوق سا ہے۔ تو بھئی اپنا اپنا شوق ہے یہ۔

بچو! یہ کرشن چندر بھی ترقی پسندوں کی جامع مسجد کے امام رہ چکے ہیں مگر چوں کہ اذان دینے سے گھبراتے ہیں، لہٰذا اب صرف مجاور بن کر رہ گئے ہیں۔

تم ان کا نام یاد رکھو۔

❖ ❖

لام

لام۔ احمد

لام

لام۔احمد

بچو! یہ تمہارے ابا جان کے عہد کے افسانہ نگار۔

آگرے کی تین چیزیں مشہور ہیں۔ تاج گل، دال موٹھ اور ل۔احمد۔

تاج محل اور دال موٹھ کی شہرت بدستور قائم ہے مگر ل۔احمد نے مشہور ہونے کا مشغلہ مدت سے ترک کر دیا ہے۔ ان کے افسانے اب تک بعض تاریخی کتابوں میں پائے جاتے ہیں جن کو محکمۂ آثار قدیمہ نہایت احتیاط سے محفوظ کر رہا ہے۔

بچو!

ل۔احمد کے افسانے اگر کہیں مل سکیں تو ضرور پڑھ لو تاکہ تم کو بھی صدمہ ہو سکے کہ اتنے اچھے لکھنے والے نے لکھنا کیوں بند کر دیا۔ یہ ہمارے افسانوی ادب میں اپنی راہ الگ نکال کر ہم کو اس راہ پر بھٹکتا ہوا چھوڑ گئے اور اب آگرے میں بیٹھ خود تو تجارت کر رہے ہیں اور ہمارے بھٹکنے کا تماشہ خاموشی سے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔

بچو!

یہ ل۔احمد ہمیشہ سے ایسے سنجیدہ بزرگ نہ تھے بڑے ہنگامے کی زندگی بسر کر چکے ہیں۔ بڑی روانی تھی ان کی جوانی بھی، بڑے منچلے تھے اپنے وقت کے یہ بزرگ بھی مگر اب تو جیسے تھک ہار کر رہ گئے ہوں۔ سنا تھا کہ ادیب کبھی بوڑھا نہیں ہوتا مگر ل۔احمد نے خدا جانے کیوں پنشن لے لی ہے۔ بہرحال تم ان کا نام یاد رکھو۔

⁂

میم

مجنوں گورکھ پوری

میم

مجنوں گورکھپوری

بچو! مجنوں گورکھپوری کو دیکھو تو ان کو اپنا دوست اور ہم جولی سمجھ کر یہ نہ کہنا کہ آؤ چلیں کھیلیں۔ ان کا قد چھوٹا ہے مگر یہ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ان سے مل کر تم کو یہ کہاوت یاد آنا چاہیے کہ ”نام بڑے اور درشن چھوٹے۔“ پھر جب تم بڑے ہو کر ان کے افسانے پڑھو گے تو تم کو ضرور تعجب ہوگا کہ اتنا سا آدمی کتنا بڑا انسان تھا۔

بچو! مجنوں گورکھپوری اردو کے ان چند انشا پردازوں میں سے ہیں جن کو اردو کی تاریخ کبھی نہ بھلا سکے گی۔ یہ ایک قابل باپ کے قابل بیٹے ہیں۔ خدا کرے قابل بیٹوں کے باپ بھی کہلائیں۔

بچو!

مجنوں گورکھپوری بڑے ہنس مکھ مگر خطرناک طور پر سچے آدمی ہیں۔ وہ اخلاقاً بھی جھوٹ نہیں بولتے اور بعض اوقات سچ بولتے وقت نہایت ہی کھرے نظر آتے ہیں اور بڑے سے بڑے دوست کا دل رکھنے کے لیے بھی جھوٹ نہیں بولتے۔ مثلاً یہ معمولی سا جھوٹ ہے کہ کسی کا شعر سن کر تعریف کر دی جائے۔ مگر مجنوں گورکھپوری گھٹیا شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے۔ لوگ ان کی اس سچائی کو ان کا غرور سمجھتے ہیں، مگر وہ جھوٹ بولنے سے مغرور ہونا پسند کرتے ہیں۔

بچو! تم ان کے افسانے ضرور پڑھو اور ان کا نام یاد رکھو۔

❖ ❖

نون

ن-م-راشد

نون

ن۔م۔راشد

دیکھو بچو!

یہ ن۔م۔راشد ہیں۔ اپنے وقت کے بہت بڑے شاعر، یہ بہت اچھی غزلیں کہتے تھے مگر جب ان کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں اور شاعر بھی اچھی غزلیں نہ کہنے لگیں تو باقی شاعروں کو بہکانے کے لیے کچھ آزاد نظمیں بھی کہہ ڈالیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب آزاد نظمیں کہنے لگے اور جب لوگ آزاد نظمیں کہنے لگے تو یہ پھر اطمینان سے غزل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اب کوئی آزاد نظم نہیں کہتا۔ اس لیے کہ آزاد نظم کہنے والے خود آزاد ہو چکے ہیں اور آزادی ملنے کے بعد سے اگر غزل نہ بھی کہہ سکیں تو قومی ترانے کہتے رہتے ہیں۔

بچو!

تم اگر کہیں آزاد نظم دیکھنا تو پڑھنا نہیں، ورنہ ہنسی آجائے گی۔ خیر ہنسنا تو کوئی بری بات نہیں مگر اس نظم کو یاد کرنے کی صرف اس وقت کوشش کرنا جب پہاڑے یاد کرنے کو جی چاہے اور ایک بات گرہ میں باندھ لو کہ اس نظم کو گانے کی کبھی کوشش نہ کرنا۔ اس لیے کہ علم موسیقی میں اب تک کوئی راگ ایسا ایجاد نہیں ہوا ہے جس میں آزاد نظم گائی جا سکے۔ یہ نظم کسی ایسے ستار پر بجائی بھی نہیں جا سکتی جس کے تمام تار صحیح سالم ہوں۔

بچو! یہ ن۔ م۔ راشد اپنے نام کو دستخط اس لیے بنائے ہوئے ہیں کہ ان کا نام نذر محمد ہے اور یہ نام ان کو پسند نہیں۔ اس لیے سعادت مندی کی وجہ سے والدین کا رکھا ہوا نام تو نہیں بدلتے البتہ انگریزی طریقے پر اس ناپسندیدہ نام کے حروف لے لیے ہیں تاکہ چھوٹے نام کے بڑے درشن رہیں۔ فیشن کا فیشن اور نام کا نام۔

بچو!

ن۔ م۔ راشد بہت عمدہ آدمی بھی ہیں اور چوں کہ جہاں دیدہ ہیں اس لیے ان سے بات کرکے معلوم ہوتا ہے کہ بات کرنے والا سیاحت کر رہا ہے۔ پہلے ریڈیو میں تھے پھر فوج میں گئے۔ پھر ریڈیو میں آئے اور اب امریکہ میں ہیں خدا کرے اس نئی دنیا سے شاعری کی کوئی نئی صنف لے کر آئیں تاکہ کچھ دن اس کے بھی چرچے رہیں۔

بچو!

ان ن۔ م۔ راشد کا کلام اگر پڑھنا ہے تو ان کی غزلیں ڈھونڈو۔ نئی شاعری میں یہ پرانا شاعر تم کو مشکل سے ملے گا اور ان کا کلام بھی سمجھنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم صرف ان کا نام یاد رکھو۔

* * *

واوَ

وقار عظیم

واؤ

وقار عظیم

بچو! یہ وقار عظیم ہیں جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو یہ تم کو پڑھائیں گے۔ جلدی جلدی پڑھو تاکہ اسکول سے کالج میں پہنچو اور وقار عظیم تم کو پڑھائیں، سنا ہے کہ ان کا پڑھایا ہوا لکھنے بھی لگتا ہے۔

بچو! یہ وہی وقار عظیم ہیں جو پہلے رسالہ ''نقوش'' کے ایڈیٹر تھے اور اب بھی رسالہ ''نقوش'' سے ان کو ویسی ہی محبت ہے، محبت تو خیر ان کی عادت بن گئی ہے۔ سب ہی سے محبت کر لیتے ہیں اور محبت اس لیے جڑ پکڑ لیتی ہے کہ لڑنا، دشمنی کرنا اور دشمن بنانا ان کو آتا ہی نہیں۔ کالج میں پروفیسر ہیں مگر ادائیں طالب علمانہ ہیں۔ زندگی بھر میں صرف دو شوق پیدا ہوئے پڑھنے کا شوق اور پھر پڑھا ہوا اگلنے کے لیے لکھنے کا شوق۔

دھان پان جسم بھی کچھ عجیب کلک نما پایا ہے۔ ہر وقت ہنسنے والی آنکھیں اور ان آنکھوں میں اپنے مخالف کے لیے محبت کی چمک، ہوا کا تیز جھونکا آ جائے تو یہ نقاد اڑ جائے مگر کسی ادبی بحث میں حصہ لے تو معلوم ہو کہ یہ وقار عظیم نہیں بلکہ ایک کوہِ وقار ہے جو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ بحث بھی مسکرا مسکرا کر فرمائیں گے۔ مدِ مقابل معلوم نہیں دلائل سے پسپا ہوتا ہے یا اس تبسم سے بہر حال پسپا ہوتا ضرور ہے اور اس کی پسپائی یا اپنی فتح کا بھی آپ کی صحت پر کوئی نمایاں اثر نہیں ہوتا۔ کسی پر تنقید کریں گے تو وہ اس طرح خوش ہوگا گویا یہ نقاد اس کو داد دے رہا ہے بے داد گر ہو تو ایسا۔

وقار عظیم یقیناً خوب صورت آدمی نہیں ہیں مگر ان میں حسن یقینی طور پر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ حسن بیان نہ ہو سکے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بحیثیت مجموعی ان میں بلا کی دل کشی ہے اب خواہ یہ دل کشی ان کی اس شرافت کی ہو جو ہر وقت ان پر طاری رہتی ہے یا اس انکسار کی جس کو باقی رکھنے کے لیے غالباً وہ دانستہ اپنی صحت خراب رکھتے ہیں۔

بچو! ان کا نام نہ بھولنا۔

◆ ◆

ےٕ

ہاجرہ مسرور

ہے

ہاجرہ مسرور

بچو!

یہ ہاجرہ مسرور ہیں۔ وہی ہاجرہ مسرور جن کا ذکر خدیجہ مستور کے سبق میں آ چکا ہے۔ یہ اس دور کی بہت بڑی افسانہ نگار خاتون ہیں اور ان چند خواتین میں سے ہیں جن کی وجہ سے بہت سے غور و فکر کے مریض مرد ہر کام چھوڑ کر صرف اس بات پر غور کیا کرتے ہیں کہ اگر جب امتیاز علی، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، قرۃ العین اور خدیجہ مستور قسم کی عورتیں برابر پیدا ہوتی رہیں تو ہم ناقص العقل کس کو کہا کریں گے۔

بچو!

ان مفکرین کو اندیشہ یہی ہے کہ کہیں یہ خود ناقص العقل بن کر نہ رہ جائیں۔

بچو!

یہ اندیشہ غلط بھی نہیں تم ذرا ہاجرہ مسرور کے افسانے پڑھ کر دیکھو اور پھر ویسا ہی افسانہ لکھنے کی کوشش کرو تو تم کو اندازہ ہوگا کہ تم تیزی سے ناقص العقل بن رہے ہو۔

بچو!

یہ میٹھی میٹھی زبان میں ایسے افسانے لکھتی ہیں کہ ان کی گہرائیوں میں جانے سے پہلے تم کو اپنی زبان اردو سے سچ مچ کا عشق ہو جائے گا۔ بعض اوقات تم کو محسوس ہوگا کہ تم ہاجرہ مسرور

کا افسانہ نہیں پڑھتے بلکہ ان سے باتیں کرتے ہو۔

''اللہ کرے یہ منحوس سنجیدگی اُڑ جائے دنیا سے میں نے کلپ کر یہ دعا مانگی۔''

یہ اڑ جائے اور کلپ کر''...... بھئی اللہ تم سمجھتے کیوں نہیں۔

بچو! یہی تو وہ زبان ہے جو اس طرح لکھی جاتی ہے کہ پڑھنے والے تحریر و تقریر سمجھنے لگیں اور پھر تشبیہیں ایسی کہ

''واچ کا چقندر جیسا منہ کھاری شلغم میں تبدیل ہو گیا۔''

اگر تم نے چقندر اور شلغم دونوں ترکاریاں کھائی ہیں تو سبحان اللہ اور اگر نہیں کھائی ہیں صرف دیکھی ہیں تو بھی تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہاجرہ مسرور نے کتنے بڑے سمندر کو ان دو ترکاریوں میں بند کر دیا ہے۔

بچو!

ہاجرہ مسرور افسانہ نگار بنی نہیں ہیں، پیدا ہوئی ہیں اس پر طرہ ان کی زبان دانی، بلکہ زبان دانی بھی نہیں، اہل زبان ہونا۔ اہل زبان کی زبان میں مٹھاس اور رس ہوتا ہے اور زبان دان کبھی کبھی زبان درازی بھی کر جاتا ہے جو ہاجرہ مسرور نہیں کرتیں۔

بچو!

ہاجرہ مسرور کو اگر تم نے بھلایا تو تمہارا چقندر جیسا منہ کھاری شلغم بن جائے گا۔ لہذا یاد کرو۔

* * *

لیے

یوسف حسن

سائی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

یے

یوسف حسن

بچو! دعا کرو کہ خدا حکیم یوسف کی عمر میں برکت دے۔ یہ اپنی زندگی ہی میں ایسے خانہ نشیں ہو گئے ہیں کہ تم میں سے بہت سے بچے ان کو جانتے بھی نہ ہوں گے۔

بچو! اپنے ابا جان سے پوچھو کہ ان کے زمانے کا سب سے مشہور اور ہر دل عزیز رسالہ کون سا تھا تو وہ جواب دیں گے ''نیرنگِ خیال'' اور یہ حکیم یوسف حسن اُسی نیرنگِ خیال کے ایڈیٹر ہیں۔ مگر ''نیرنگِ خیال'' اور وہ دونوں بوڑھے ہو گئے۔ ورنہ یہی وہ ''نیرنگِ خیال'' تھا جس نے ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ جس کے سالناموں اور خاص نمبروں کی ایک دھوم تھی۔

بچو! حکیم یوسف حسن حکیم بے شک ہیں مگر ان کو نبض شناسی سے زیادہ ادب شناسی پر ناز ہے اور یہ ناز غلط بھی نہیں ہے۔ ان کے اثر و رسوخ نے ''نیرنگِ خیال'' میں وقت کے تمام بڑے بڑے ادیبوں کو یکجا کر دیا تھا۔ جب تک یہ شیرازہ قائم رہا ''نیرنگِ خیال'' کا جواب نہ تھا۔ جب یہ شیرازہ منتشر ہوا تو ''نیرنگِ خیال'' خواب و خیال بن کر رہ گیا۔

بچو! دعا کرو کہ حکیم یوسف حسن پھر انگڑائی لے کر اٹھیں اور اپنی صلاحیتوں سے ''نیرنگِ خیال'' کو پھر اپنے آزمودہ نسخے کی طرح پیش کریں تا کہ لوگ یاد رکھ لیں۔

❖ ❖

۔۔۔

یاس یگانہ چنگیزی

ے

یاس یگانہ چنگیزی

چھوٹی ’’ی‘‘ سے نہیں بلکہ بڑی ’’ے‘‘ سے یاس۔ چھوٹی ’’ی‘‘ یاس کے متعلق کہتی ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات یہ غالب کو چچا بنا کر چھوڑنے والے یاس عظیم آبادی ہیں۔

بچو!

یہی وہ مرزا یاس یگانہ ہیں جو اپنے کو مرزا یاس یگانہ چنگیزی علیہ السلام لکھتے ہیں۔ خیریت گزری کہ شاعر تھے، صرف غالب اور عزیز سے انکار کیا ہے اور اپنے کو علیہ السلام کہا ہے۔ شاعر نہ ہوتے تو خدا سے انکار کرتے اور خدائی کا دعویٰ کرتے۔

بچو!

مرزا یاس بہت بڑے شاعر ہیں، پڑھے لکھے شاعر زبان اور ادب کے بہت بڑے ماہر، باوجود اس ٹھوس قابلیت کے کلام بھی نخس نہیں ہوتا۔ بس ایک ذرا سی بات یہ ہے کہ بہت سی بلندیوں کو پست دیکھتے ہیں اور اتنے بڑے زبان داں ہونے کے باوجود بدزبانی پر اتر آتے ہیں۔ ان کے لیے عام خیال یہ ہے کہ وہ اتنے زبان داں نہیں جتنے بڑے بدزبان ہیں۔ اگر یہی شخص زبان کا بھی اتنا ہی میٹھا ہوتا جتنا کلام کا میٹھا ہے تو لوگ عزت اور احترام سے بہت بڑی جگہ دیتے مگر چوں کہ خود مرزا یاس نے اپنے کو اتنی بڑی جگہ دے رکھی ہے جو لوگوں کے نزدیک ان کی حیثیت سے زیادہ ہے لہٰذا ان کے قدرداں بھی ان کو ان کی اصل جگہ پر واپس

لانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں اور اپنے قدر دانوں کی ان کوششوں کو دیکھ کر مرزا یاس مستقل طور پر چڑچڑے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایسے چڑچڑے کہ ان کو سلام کرتے جی ڈرتا ہے کہ کہیں جواب میں گالی نہ دے بیٹھیں۔

بچو!

مرزا یاس دراصل مریض ہیں ان کو وہی مرض لاحق ہے جو نمرود اور شداد کو تھا۔ وہ خداوندِ عالم کے حریف نہ سہی مگر خداوندِ سخن کے حریف ضرور ہیں۔ کمالِ فن سے انکار نہیں مگر برا ہو اس احساسِ کمتری کا جس نے مرزا یاس کو احساسِ برتری کی زبردستی میں مبتلا کر کے ایک مستقل لطیفہ بنا دیا ہے۔ ایک دلچسپ شخصیت، پہلے لوگ ان پر غصہ کرتے تھے اب ہنسنے لگتے ہیں۔

بچو!

اگر تم کلامِ یاس سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو اس کو یاس کا کلام سمجھ کر پڑھو۔ ان کو صرف سبق یاد کرنے کے لیے یاد رکھو۔

◆ ◆

متفرقات

جگر مرادآبادی

یہ ذکر ہے ۱۹۲۷ء کا، میں حساب میں کم زور ہوں مگر غالباً پچیس برس گزرے۔ ایک عمر ہوئی یہ تو، بلکہ اس عمر کا آدمی تو اگر احتیاط سے کام نہ لے تو صاحب اولاد تک ہو جاتا ہے۔ بہرحال معاف کیجیے گا یہ اتنی ہی پرانی بات ہے کہ یو۔ پی کے شہر مین پوری میں ایک مشاعرہ تھا۔ ایسا بے ہودہ مشاعرہ کہ لاحول ولاقوۃ۔ تھوڑی دیر تک تو یہ مشاعرہ اونگھتا رہا اس کے بعد ایسا سویا ہے کہ شاعر کی آواز چوکی دار کی آواز معلوم ہوتی تھی "سونے والو جاگتے رہو" میں بھی ایک طرف بیٹھا غالباً سونے کی مشق کر رہا تھا کہ ایک دم طوفان آ گیا۔ سب اس بری طرح چیخے ہیں کہ میں واقعی اُچھل پڑا اور اب جو دیکھتا ہوں تو ایک صاحب جن کا چہرہ غائب تھا شمع محفل کے سامنے بیٹھے جھوم رہے تھے۔ چہرہ غائب یوں تھا کہ سر کے تمام بال اپنی تمام ژولیدگی کے ساتھ اس طرح داڑھی سے اُلجھے ہوئے تھے گویا یہ ایک مسلسل داڑھی ہے جو سر سے شروع ہو کر تمام چہرے کو چھپاتی ہوئی گردن تک آئی تھی اور یہ داڑھی سیاہ فر کی اس ٹوپی سے لہلہا کر نکلی تھی جو ان صاحب کے سر پر نہایت بے ڈھنگے پن سے رکھی ہوئی تھی۔ ملگجی سی شیروانی جس کے تمام بٹن کھلے ہوئے۔ شیروانی کے نیچے قمیص جس کے رنگ کا صحیح اندازہ ناممکن تھا۔ چوڑی دار پاجامہ جو کسی زمانے میں یقیناً سفید ہوگا اور اس وضع قطع کے ساتھ یہ صاحب غزل پڑھ رہے تھے۔ آواز ایسی کہ روح اس کی کھنک محسوس کرے اور کلام ایسا کہ اس مشاعرے کے سامعین جو داد دینے میں متانت کی حدوں سے گزرے ہوئے نظر آ رہے تھے حق بجانب نظر آنے

لگے۔ میں جس وقت ہوش میں آیا ہوں اس فضا پر یہ شعر برس رہا تھا:

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھ لیں زاہد
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا

کتاب اُٹھا، شباب اُٹھا، شراب اُٹھا ایسی زمین نہیں ہے کہ اس کو اس آسانی کے ساتھ آسان بنایا جا سکے مگر یہاں تو عالم یہ تھا کہ ایک سے ایک ڈھلا ہوا شعر ساعت میں کھنک رہا تھا۔ ابھی اس شعر پر جھوم ہی رہے تھے کہ شاعر نے جھوم کر دوسرا شعر پڑھا:

مجھے اُٹھانے کو آیا ہے واعظِ ناداں
جو اُٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اٹھا

اور پھر یہ شعر:

نشانِ منزلِ جذبِ تمام چھپ نہ سکا
ادھر فنا ہوا قطرہ ادھر حباب اُٹھا

اور آخر میں مقطع:

کہاں یہ بار کہاں پائے نازکِ جاناں
اُٹھا سر، او جگر خانماں خراب اُٹھا

یہ تھے جگر، وہ جگر مرادآبادی جن کی دھوم سن چکے تھے اور ملاقات آج اس طرح ہوئی کہ جب آپ غزل پڑھ چکے اور چہرے پر چھائے ہوئے بال چہرے سے ہٹا کر اپنی سیاہ فرکی ٹوپی کے نیچے دباتے ہوئے آپ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھے تو بہت سے داد دینے والوں میں سے ایک میں بھی تھا۔ مین پوری کے صرف شاعر تربینی سرن شاد نے تعارف کرایا اور جگر صاحب بہت جلد ہی تعارف کی رسموں سے گزر کر بے تکلف ہو گئے پان کی وہ گلوری جو خود کھانا چاہتے تھے مجھے دے دی اور قوام کھلانے کا وعدہ کر کے ایک صاحب کو اپنے ارد گرد ڈھونڈنے لگے جن کے پاس قوام کی شیشی دیکھ چکے تھے اور پھر یہ اصرار کہ شیشی آپ ہی رکھ لیں حالاں کہ شیشی خود آپ کی بھی نہیں بلکہ آپ کے ایک دوست کی تھی۔

مین پوری میں قیام کا ارادہ بالکل نہ تھا مگر جگر صاحب نے زبردستی ایک ہفتے تک اسی گھر میں مہماں رکھا جہاں خود مہمان تھے اور مارے خلوص کے اپنے میزبان کو طاق پر بٹھا کر خود ان کی اور اپنے دوسرے مہمانوں کی مدارت میں مصروف ہو گئے۔ مین پوری میں جگر صاحب اُس زمانے میں منشی اصغر حسین اصغر مختار کے یہاں اپنا ہیڈ کوارٹر بنائے ہوئے تھے۔ فرخ آباد چلے گئے اٹاوہ چلے گئے یا جہاں بھی کوئی پکڑ لے گیا چلے گئے اور پھر اصغر صاحب کے یہاں واپس آ گئے۔ معلوم نہیں اصغر صاحب سے یہ تعلق حضرت اصغر گونڈوی کے ہم نام ہونے کی وجہ سے تھا یا جگر صاحب کی قسمت ہی میں محبت کرنے کے لیے ہر قسم کے اصغر لکھے ہوئے تھے مگر اصغر کی یہ مین پوری والی قسم بھی واقعی محبت کرنے کے قابل ایک چیز تھی۔ سفید ڈاڑھی اور لمبے قد کا یہ بھولا بھالا آدمی اپنی شخصیت میں اس قدر محبوبیت رکھتا تھا کہ اس "بزرگ بچے" کو دیکھ کر خواہ مخواہ پیار آتا تھا پھر جگر صاحب کو ان کے گھر پر ایسا اقتدار حاصل تھا کہ واقعی خود صاحب خانہ جگر صاحب ہی کے مہمان نظر آتے تھے۔ میرے لیے ایک نزاکت یہ بھی تھی کہ اس مین پوری کو میری سسرال کی حیثیت بھی حاصل تھی میرے خسر صاحب محترم حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب مرحوم و مغفور اس زمانے میں یہیں بسلسلۂ ملازمت موجود تھے اور ملازمت کے علاوہ ایک مستقل حیثیت ان کو یہ حاصل تھی کہ مین پوری کے مشاعروں کی صدارت کا گویا آپ ہی کے پاس ٹھیکہ تھا ان کی موجودگی میں جگر صاحب کا مہمان بن کر رہنا ظاہر ہے کہ عجیب سی بات تھی مگر خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے خسر صاحب کو ان کو سوائے اس بات کے کوئی اعتراض نہ ہوا کہ جگر کی صحبت بہر حال ایک رند کی صحبت تھی اور باوجود ضبط کرنے کے اتنا تو کہہ ہی دیا کہ:

"بھئی یہ جگر کم بخت بہت پیتا ہے بس یہی نہایت لغو بات ہے اس میں"

مطلب یہ تھا کہ اس لغویت سے قریب تر رہ کر ایک ہفتے کے بعد جگر کو اپنی روح پر طاری کیے اور ان ہی کے شعر گنگناتے مین پوری سے لکھنؤ واپس آ گئے۔

اس ملاقات کے بعد تو یہ حال ہو گیا کہ جہاں کہیں بھی مشاعرے میں گئے اور یہ معلوم

ہوا کہ جگر صاحب بھی موجود ہیں سیدھے پہلے جگر صاحب کے پاس پہنچے اگر وہ ہوش میں ہوئے تو خود جا کر میرا سامان اپنے میزبان کے گھر اٹھوا لائے اور اگر ہوش میں نہ ہوئے تو میں نے خود اپنا سامان اٹھالایا اور ان کی تیمارداری شروع کر دی۔ مگر اس قسم کی تیمارداری میں صرف ایک مرتبہ میں نے اناڑی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ بھوپال میں مشاعرہ تھا۔ اطراف ہند سے منتخب شعرا نواب صاحب بھوپال کی سالگرہ کے جشن کی تقاریب میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میرا اور جگر صاحب کا قیام تربینی سرن شاد کے یہاں تھا جو ان دنوں بھوپال میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ ذرا ملاحظہ کیجیے کہ بھوپال میں بھائی جان مولانا ارشد تھانوی کا گھر موجود ہے اور اس گھر میں لے دے کر صرف ایک بہن محبت چھڑکنے کے لیے موجود ہے کہ بھائی آئے تو ماں جائے پر واری جائے مگر بھائی ٹھہرے ہوئے تربینی سرن شاد کے یہاں تاکہ جگر سے قریب رہیں جگر صاحب پر ان دنوں پینے کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ تین دن سے دن رات بس پی رہے تھے اور پیے چلے جاتے تھے۔ خوشامد کی بچوں کی طرح بہلایا۔ ڈانٹا۔ غصہ کیا مگر وہ اس عالم ہی میں نہ تھے کہ ان میں سے کسی کا اثر لیتے ان کو سمجھانے کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے بوتل سے گلاس میں انڈیل کر دینا پڑتی تھی۔ تیسری رات ان کی حالت نازک ہو گئی۔ رات کے تین بجے ہوں گے کہ انہوں نے بجائے شراب کے پانی مانگا۔ معوم نہیں کیوں میں نے طے کر لیا کہ بس اب یہ قصہ ختم ہے اور چل چلاؤ ہے ان حضرات کا غالباً میں نے کسی سے سن رکھا تھا کہ شرابی اگر شراب پیتے پیتے پانی مانگے پینے کے لیے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بس چلا اب۔ چنانچہ جگر صاحب کے اس مطالبے پر میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ایک تو میرے نزدیک جگر صاحب کا یہ عالم نزع دوسرے میں موت سے ذرا گھبراتا بھی ہوں اور یہ تو ہرگز گوارا کر ہی نہیں سکتا کہ تنہائی میں جہاں صرف میں ہوں کوئی صاحب یہ شوق پورا کرنے لگیں۔ میں بجائے پانی دینے کے دوڑا تربینی سرن کو جگانے اور جگا لایا بہاری چرن صدق اور تربینی سرن دونوں کو کہ جگر ختم ہو رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی دونوں کے علاوہ اور بھی بہت سے آدمی جمع ہو گئے مگر جب وجہ بتائی میں نے کہ پانی مانگ رہے تھے تو وہ مذاق اُڑا ہے میرا کہ اپنی

معصومیت کا خود بھی قائل ہونا پڑا۔

انجمن معین الادب لکھنؤ کا ایک سالانہ مشاعرہ تھا۔ طے ہوا کہ جس طرح بھی ہو جگر مرادآبادی کو اس مشاعرے میں ضرور شریک کیا جائے مگر جگر ملیں کہاں؟ نہ ان کا کہیں پتا نہ نشان۔ پتا تو اس کا ہوتا ہے جس کا کہیں گھر ہو اور جگر اس زمانے میں خانہ بدوشی کی بلکہ مے خانہ بدوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ طے یہ کیا گیا یہ کام شوکت تھانوی اور اس زمانے کے شاعروں کے چودھری مولانا وصل بلگرامی مرحوم کر سکتے ہیں چنان چہ ہم دونوں انہیں ڈھونڈنے نکلے۔ مین پوری میں ڈھونڈھا۔ آگرے میں ہر مے خانہ چھان مارا اور ملے آپ کہاں فرخ آباد میں وہ بھی اس حالت میں کہ نہ ان کو ہمارا ہوش تھا نہ اپنا۔ اسی حالت میں ان کو لے کر لکھنؤ روانہ ہو گئے اس لیے کہ اب وقت اتنا کم رہ گیا تھا کہ بمشکل مشاعرے کے وقت پر لکھنؤ پہنچ سکتے تھے اب مصیبت یہ تھی کہ معین الادب کا یہ مشاعرہ طرحی تھا اور نہایت سختی سے اس ضابطہ کی پابندی ہو رہی تھی کہ خواہ کوئی بھی ہو کسی سے غیر طرح کلام نہ سنا جائے گا۔ ادھر ان حضرت کا عالم یہ کہ شعر کہنا کیا معنی یہ بات بھی ڈھنگ سے نہ کر سکتے تھے۔ خدا خدا کر کے کانپور کے اسٹیشن پر آپ نے پوچھا کہ میں کہاں ہوں اور جب آپ کو بتایا گیا کہ آپ لکھنؤ جا رہے ہیں تو بمشکل تمام آپ سمجھ سکے کہ واقعہ کیا ہے۔ موقع غنیمت جان کر وصل صاحب نے اور میں نے اُن سے طرح میں کچھ کہنے کی درخواست کی اور آخر مشاعرے تک پہنچتے پہنچتے وہ شعر آپ نے کہہ لیے جو آج تک مجھے یاد ہیں:

محیط عشق میں جو کچھ بھی تھا اک عالم دل تھا
اسی ذرے میں دریا تھا اسی قطرے میں ساحل تھا
خوشا وہ دور جب آغاز درد عشق کامل تھا
مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں سر تا بہ پا دل تھا

اور یہ واقعہ ہے کہ یہی دو شعر حاصل مشاعرہ تھے۔ مگر اس خود فراموشی کے زمانے میں بھی عالم یہ تھا کہ مشاعرے کے لیے غزل کہی ہے کہ کوئی صاحب جن کو کسی حکیم نے نسخے میں

لکھ دیا ہے کہ شاعری ضرور کرو خواہ شعر کہہ سکو یا نہ کہہ سکو تشریف لے آئے اور چپکے سے کہہ دیا کہ "طرح میں فکر نہیں کر سکا۔" آپ نے اپنی غزل ان کے سامنے رکھ دی وہ شعر چن لے گئے۔ کوئی اور صاحب اسی قسم کے آئے وہ بھی ایک آدھ لے بھاگے کسی کو کوئی مطلع پسند آ گیا وہ لے گئے اور تھے اور تلچھٹ ان کے حصے میں رہ گئی میں اس بات پر بہت جلا کرتا تھا اور اکثر فوج داری کی نوبت آ گئی لہٰذا اس معاملہ میں مجھ سے چوریاں ہونے لگیں مگر یہ سلسلہ جاری رہا اور اب بھی جاری ہے حالاں کہ ان سے پوچھیے تو نہایت برہمی کے ساتھ انکار کر جائیں گے۔

اُردو کے اسس حافظ نے مین پوری میں اپنے لیے شیراز بھی مہیا کر لیا تھا۔ اپنے ہر بے تکلف دوست کو شیراز کی سیر کراتے تھے جہاں جاتے تھے جذبۂ پرستش لے کر مگر واپس آتے تھے معبود بن کر۔ اس شیراز کا نام آپ نے طور بھی رکھا تھا اور صاحبانِ طور سے تعلقات اس قسم کے تھے کہ خود نہ کبھی موسیٰ بنے نہ برقِ طور کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ کلیم کی تابِ نظر آزمائے۔ معلوم نہیں اسے کلیم سے دلچسپی تھی یا کلام سے۔ بہر حال جگر صاحب کی حیثیت میرے نزدیک صرف آنریری مجسٹریٹ کی تھی۔

اب تو اللہ رکھے جگر صاحب گھر گرہست ہو گئے ہیں۔ سخت جان ایسے کہ شراب پی پھر شراب نے ان کو پیا آخر شراب ان سے چھوٹی اور یہ شراب سے، مدت سے پیتے نہیں مگر تمام رندانہ ادائیں آج بھی موجود ہیں۔ بچوں کا سا معصوم دل جس سے کیسے ذرا سی بات پر لڑ و مگر لڑ کر بھی روٹھنا نہیں جانتے جس سے لڑتے ہیں اسی کو مناتے بھی خود ہیں۔ سب کہتے ہیں جگر بہت بڑا شاعر ہے مگر میں کہتا ہوں جگر بہت بڑا انسان ہے اور شاعری اس کی شخصیت کا صرف ایک پرتو۔

◆ ◆

نقوش کے نقاش

(طفیل)

کہتے ہیں کہ اس دنیا کے جب سب جان دار مر چکیں گے اور ملک الموت سب کو مارنے کے بعد اکیلے رہ جائیں گے تو ان کو بھی موت آئے گی اور ان کو بھی مرنا پڑے گا۔ خیر یہ تو جب کبھی ہوگا دیکھا جائے گا مگر اسی قسم کا ایک واقعہ حال ہی میں پیش آیا ہے کہ ادارہ فروغ اُردو کے مالک، رسالہ نقوش کے ایڈیٹر اور اپنے وقت کے لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والے ناشر محمد طفیل صاحب کی بھی ایک کتاب چھپ کر بازار میں آئی ہے اور دوسرے مصنفوں کو چھاپنے والے یہ حضرت خود بھی چھپ کر رہ گئے ہیں۔ کسی گم نام شاعر نے اسی قسم کے مواقع کے لیے کتنا نام ور مصرع کہا ہے کہ:

پھانس کر دو چار بلبل پھنس گیا صیاد بھی

طفیل صاحب کی اس تصنیف کا نام ہے "صاحب" اور اس میں ان کے وہ سات مضامین ہیں جو سات صاحبان کی شخصیت پر لکھے گئے ہیں اور ان ساتوں میں جو ایک شخصیت دوسروں کی نقاب کشائی کی کوشش میں خود برافگندہ نقاب ہوئی ہے وہ خود طفیل صاحب کی شخصیت ہے۔ ان سات مضامین میں سے چھ نقوش کے پچھلے شماروں میں نکل چکے ہیں صرف ایک ایسا مضمون ہے جو اس مجموعے میں چھپا ہے۔ یہ ساتوں مضامین طفیل صاحب کے اس ذاتی مطالعے اور مشاہدے کے آئینہ دار ہیں جو وہ ان ساتوں ملنے والوں کے متعلق کر سکے ہیں

اور نہایت سادگی اور صفائی کے ساتھ ان ساتوں کرم فرماؤں کے سامنے طفیل صاحب کا آئینہ پیش کر رہے ہیں تا کہ وہ خود بھی اپنے کو طفیل صاحب کی نظر سے دیکھ لیں اس ہفت پیکر کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں:

(۱) سعادت حسن منٹو۔ (۲) احمد ندیم قاسمی
(۳) شوکت تھانوی (۴) جگر مرادآبادی
(۵) فراق گورکھپوری (۶) عابد علی عابدؔ
(۷) احسان دانش

باقی چھ حضرات کے متعلق تو میں وثوق سے کچھ عرض نہ کر سکوں گا جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے جو خود میرے متعلق لکھا گیا ہے مجھ کو ایمان داری کے ساتھ اعتراف ہے کہ میں نے اپنی اتنی جامع تصویر اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہ تصویر وہ نہیں ہے جو ہونے والی سسرال بھیجنے کے لیے لوگ خاص طور پر کھنچوانے کے بعد بنواتے بھی ہیں کہ گال اگر پچکے ہوئے ہیں تو ذرا ابھر دیے جائیں، آنکھیں اگر چندھی ہیں تو ذرا روشن کر دی جائیں، رنگ اگر کالا ہے تو ذرا گورا کر دیا جائے۔ بلکہ یہ تصویر اصل خدوخال کے ساتھ جوں کی توں پیش کر دی گئی ہے۔

خود اپنے متعلق اس قسم کا منہ پھٹ سچ اس مضمون سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک آدھ مقام پر اگر مجھے شبہ بھی ہوا تو مجھ کو مجھ سے زیادہ سمجھنے والوں نے یہ کہہ کر اس شبہ کو دور کر دیا کہ آپ مانیں یا نہ مانیں بات سچی لکھی ہے ایک مقام پر مجھے شدید اختلاف تھا جہاں طفیل صاحب نے لکھا ہے:

> ”میں بھی کوئی آٹھ دس مشاعروں میں ان کا کلام ان کے ترنم سمیت سن چکا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ سوائے دو ایک مشاعروں کے باقی سب میں بڑے اعلی پیمانے پر ہوٹ ہوئے۔“

میں یہ کہہ رہا تھا کہ صرف دو مشاعروں میں ہوٹ ہوا ہوں ایک میں اس لیے کہ سخن فہم متعصب تھے اور ہوٹنگ کرنے والے فیاض اور دوسرے میں اس لیے کہ تحسین ناشناس و

سکوت سخن شناس دونوں شباب پر تھے مگر یہ تو ایک ہی بات ہوئی بہر حال میں صرف دو مرتبہ ہوٹ ہوا ہوں مگر بیگم صاحبہ نے طفیل صاحب کی گواہی دی کہ خود آپ کو اندازہ نہیں ہے میں بڑے شوق سے مشاعروں میں جایا کرتی تھی مگر محض آپ کی غزل سرائی نے مجھ سے مشاعرے ترک کرائے ہیں۔ کاش آپ اپنی آواز خویش پروری سے باہر ہو کر بھی سن سکتے۔ پھر مجھ کو اس مضمون کے اس مقام پر غصہ آتے آتے رہا جہاں طفیل صاحب نے مجھے بھی خبطی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے:

> ”ان کی طبیعت کی ایک اچھائی یہ ہے کہ بیٹھے بٹھائے ناراض ہو جاتے ہیں نہ ناراض ہونے کا پلاٹ بناتے ہیں نہ کوئی اسکیم۔ نہ ہی دوسرے کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ بے چارہ مدافعت میں کچھ کہہ سکے۔“

میں نے جھنجھلا کر کہا:

”یہ غلط ہے۔ متہم کرتے ہیں۔ تہمت لگاتے ہیں اتہام ہے سراسر۔“

وہ بولیں: ”حرف بہ حرف صحیح ہے۔“

میں نے کہا:

”صحیح کیسے ہے یہ تو پاگل پن ہے کہ بے وجہ کوئی ناراض ہو جائے میں بغیر کسی وجہ کے کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوا۔“

وہ بولیں: ”کبھی شاید نہ ہوئے ہوں مگر اکثر ہو جاتے ہیں۔“

میں نے واقعی مشتعل ہو کر کہا مثلاً: ”ناراض ہوا میں۔“

وہ بولیں: مثلاً اسی وقت ہو رہے ہیں۔“

اور مجھ کو واقعی اندازہ ہوا کہ میں خود اس دعوے کی دلیل پیش کر رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے یہ صفحہ الٹ دیا اور ایک مقام پر بے ساختہ داد دی۔

”ذرا بادل گرجے۔ بجلی چمکے پھر دیکھیے آپ کا مزاج نادری حکم

> کے ماتحت تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کرا دیں گے۔ اس کے بعد خود اٹھیں گے، چٹخنیاں دیکھیں گے کہ کہیں کوئی چٹخنی کھلی تو نہیں رہ گئی۔ پہلے خود اٹھنے کے بجائے دوسروں کو اس لیے حکم دیں گے کہ مبادا بجلی اندر گھس کر تبادلۂ خیالات کر ڈالے۔"

میں اس تبادلۂ خیالات کر ڈالنے کی داد ہی دے رہا تھا کہ بیگم صاحب نے یہ فقرے پڑھ کر سنا دیے:

"بات کہنے والی تو نہیں ہے لیکن آپ سن لیں کہ یہ خدا کے بنائے ہوئے بتوں کی بڑی پوجا کرتے ہیں۔ کامیابیوں کا حال خدا جانے یا شوکت صاحب جانیں۔"

اور یہ سنا کر بولیں: "دیکھ لیا آپ نے۔ میں نہ کہتی تھی کہ یہ بات ہے ضرور۔"

میں نے یہ سطریں خود پڑھ کر کہا۔ مگر یہ حضرت خود اپنے اس شبہ کی تردید کر گئے ہیں اسی کے آگے مابدولت کا ایک اقتباس دینے کے بعد یہی تو لکھا ہے:

> "یہ جھوٹے تقدس کے قائل نہیں نہ اپنی لغزشوں پر نازاں ہیں بلکہ وہ سادہ سے الفاظ میں کہتے ہیں کہ بھئی میں آپ جیسا ایک انسان ہوں آپ میں اور مجھ میں فرق اتنا ہے کہ آپ جھوٹے تقدس کی آڑ میں وہ کچھ نہیں کہتے جو آپ ہیں میں تو ایک کھلی ہوئی کتاب ہوں جہاں چاہو پڑھ لو——"

اور پھر میں نے ان کو سمجھایا کہ اپنی اس قسم کی لغزشوں کو جب میں خود ڈنکے کی چوٹ پر بیان کر کے دنیا کے سامنے پیش کر چکا ہوں تو اب ان کو یا کسی کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ کامیابیوں کا حال خدا جانے یا شوکت صاحب جانیں۔ شوکت صاحب تو جو کچھ جانتے تھے اس سے سب ہی کو آگاہ کر چکے ہیں اس خطرناک اعتراف کے بعد یہ شک اور یہ شبہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے اس پر وہ کہنے لگیں کہ:

> "بس رہنے بھی دیجیے ایک مقدمے میں سرکاری گواہ بن جانے کے

> معنی یہ کہاں سے ہو گئے کہ چور، چوری سے بھی گیا اور ہیرا پھیری
> سے بھی۔ یہ چالاکی بھی تو ہو سکتی ہے کہ اس طرح اپنا بھرم قائم کر
> کے پھر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے کہ جو چاہیں کریں۔"

میں نے کہا کہ خیر آپ کا اور میرا رشتہ تو ہے ہی ایسا کہ اس میں اگر بدگمانی نہ ہو محبت ہی مفلوج ہو کر رہ جائے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ طفیل صاحب کس رشتے سے اس قدر بدگمان ہوئے۔

خیر چھوڑیے اس ذکر کو میں تو اپنے ہی مضمون میں الجھ کر رہ گیا اس کتاب میں اور مضامین بھی تو ہیں اور جس طرح اور مضامین کو پڑھ کر میرا یہ حال ہوا ہے کہ:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی طرح میرے متعلق جو مضمون ہے اس کو پڑھ کر دوسروں نے بھی یہی کہا ہوگا اور یہی طفیل صاحب کی سیرت نگاری کا کمال ہے۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون جو منٹو کے متعلق ہے اس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں منٹو اپنی زندگی کی تمام ہنگامہ آرائیوں اور وہی اس کے لغزیدہ قدم۔ وہی اس کا انداز بیان کہ مضمون پڑھتے جائیے اور منٹو کو سامنے بٹھا کر باتیں کرتے جائیے مگر دوسرے حصے میں منٹو کی طرف سے جو خط طفیل صاحب نے لکھا ہے وہ منٹو کے اسلوب تجربہ کا ایسا جامع چربہ ہے کہ منٹو کی موت بھی ذی روح نظر آتی ہے۔ اگر یہ خط منٹو کے نام سے نہ بھی ہوتا تو بجائے خود ایک اہم ادبی دستاویز کی حیثیت اس کو حاصل ہوتی۔ طفیل صاحب نے اگر اپنی اس صلاحیت کو اب تک چھپایا ہے تو خیانت سے کام لیا ہے اور اب اگر اس میں بخل برتا تو مزید خیانت ہوگی۔

دوسرا مضمون جو احمد ندیم قاسمی کے متعلق ہے ندیم صاحب کو رفتہ رفتہ میرے قریب لا رہا تھا کہ یہ حصہ آ گیا:

> "اگر یہ چارپائی پر بیٹھے ہوں تکیے سے ٹیک بھی لگا رکھی ہو اور یہ ایک
> دم اکڑوں بیٹھ جائیں تو سمجھ لیجیے کہ یہ افسانہ لکھنے والے ہیں۔ اس

> وقت یہ سگریٹ پہ سگریٹ پئیں گے۔ خوب صورت سا کاغذ لیں
> گے۔ پنسل کو باریک بنائیں گے اور مہین مہین خط میں افسانہ شروع
> کردیں گے۔ آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے۔"

میں نے کہا: "حیرت ہے ندیم صاحب کی یہ ادائیں مجھ سے کس قدر ملتی جلتی ہیں۔

بیگم نے کہا: "مگر آپ اکڑوں نہیں بیٹھتے۔"

میں نے کہا: "یہ خوب صورت سا کاغذ تو لیتا ہوں۔"

وہ بولیں: "جی ہاں مگر آپ چارپائی پر کب بیٹھتے ہیں۔"

میں نے کہا: "چلو نہ سہی مگر پنسل تو باریک بناتا ہوں"

وہ بولیں: "عموماً قلم کا باریک نب تلاش کرتے ہیں۔"

میں نے کہا: "مطلب یہ ہے کہ مہین مہین خط میں تو مضمون شروع کرتا ہوں۔

وہ اگلی سطریں پڑھوانا چاہتی تھیں۔ "آگے تو پڑھیے۔"

میں نے پڑھنا شروع کیا:

> "— آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے البتہ شعر کہنے کے
> لیے تنہائی چاہتے ہیں اس کے لیے انہیں ہلکا ہلکا گنگنانا ہوتا ہے۔
> چوں کہ یہ اپنے ترنم کا مرتبہ جانتے ہیں اس لیے کہ اس خداداد دین کا
> حال سب پر آشکار کرنا نہیں چاہتے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "دیکھیے اس کو کہتے ہیں غیرت داری۔"

میں نے جل کر کہا: "پھر آپ کا روئے سخن میرے ترنم کی طرف ہے یہ تعصب کی عجیب گھریلو قسم آپ نے نکالی ہے۔"

احمد ندیم صاحب قاسمی والے مضمون میں طفیل صاحب اپنے اس احترام کو باوجود کوشش کے چھپا نہیں سکے جو ندیم صاحب کے لیے ان کے دل میں موجود ہے۔ جب خود طفیل صاحب نے ندیم صاحب پر مضمون لکھنے کے لیے ہاجرہ بہن سے درخواست کی تھی تو ان

بے چاری نے بڑی سچی بات کہی تھی کہ:

> "اگر میں سچ سچ لکھ دوں تو یہ مضمون کتنے صفحوں پر پھیلے گا اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اتنی سچائی کا ادب میں کیا درجہ ہوگا۔ لوگ تو اسے بہن کی پیار والی بات کہہ کر ٹال دیں گے۔"

مگر خود طفیل صاحب نے بھی بھائی کی پیار والی بات سے کام لیا ہے اور صرف طفیل صاحب ہی نہیں اگر میں خود بھی ندیم صاحب کے متعلق لکھتا تو وہ بھی پیار والی بات ہی ہوتی اس لیے کہ اس شخص میں سوائے پیار کے اور ہے ہی کیا۔

جگر صاحب کے متعلق طفیل صاحب کا جو مضمون ہے وہ ایک حد تک خود میرے متعلق بھی ہے اس لیے کہ طفیل صاحب اور جگر صاحب کے مراسم کی ابتدا میرے ہی گھر پر ہوئی تھی مگر جب یہ مضمون آگے چل کر صرف جگر صاحب کے متعلق رہ گیا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ طفیل صاحب نے بھی اتنے ہی دنوں میں جگر صاحب کو اتنا ہی سمجھا ہے جتنا میں ساری زندگی کے مراسم کے بعد سمجھ سکا ہوں۔ اس مضمون میں کہاں کہیں طفیل صاحب نے جگر صاحب کے انداز گفتگو کا چربہ اتارا ہے داد دینے کو جی چاہتا ہے واقعی معلوم ہوتا ہے کہ جگر صاحب کے یہ الفاظ ان کے ذہن میں محفوظ نہ تھے بلکہ دستاویزی صورت میں موجود تھے مثلاً کہتے ہیں کہ جگر صاحب کی باتیں عموماً اس قسم کی ہوتی ہیں:

> "اگر میں آپ کے کہنے کے مطابق یہ مان لوں اور مجھے اس کا بھی یقین کامل ہو جائے کہ فلاں صاحب شعر اچھے کہتے ہیں۔ پھر بھی میں کہوں گا کہ ان میں وہی ایک چیز نہیں ہے اور وہ چیز پیدا تو ہوتی نہیں وہ تو انسان کامل اور مرد خود آگاہ میں خود ہی ہوتی ہے میری مراد خلوص باصفا ہے۔ وہ شعر بڑے بد اعمال ہوتے ہیں جو ایسے ذہنی نابالغوں پر وارد ہو جاتے ہیں۔"

میں جانتا ہوں کہ یہ جگر صاحب کا انداز بیان ہے۔ یہی الفاظ، یہی ترکیبیں، یہی

بند شیں۔ اس مضمون کا کون سا حصہ ایسا ہے جہاں صاحب مع اپنی اصلی شخصیت کے متحرک نظر نہ آتے ہوں۔

فراق والا مضمون شخصیاتی بھی ہے اور دستاویزی بھی۔ اس مضمون میں فراق کے چند نہایت اہم خطوط دے کر طفیل صاحب نے ہر ایک سے فراق کو نہایت بے تکلفی کے ساتھ ملا دیا ہے بلکہ یوں فراق سے ملنے والا شاید فراق کو نہ پا سکتا البتہ ان خطوط کے آئینے میں اور پھر طفیل صاحب کی حاشیہ آرائیوں نے فراق کو اس مضمون کے پڑھنے والوں کے بالکل قریب کر دیا ہے۔ اسی مضمون میں ایک جگہ طفیل صاحب لکھتے ہیں:

> ''الٰہ آباد تین چیزوں کی وجہ سے مشہور ہے ان میں سے ایک جواہر لال نہرو، دوسرے فراق تیسرے امرود۔''

یہ بات اکبر الٰہ آبادی بہت پہلے بڑے مزے میں کہہ گئے ہیں:

کچھ الٰہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

مگر یہ اس وقت کا ذکر ہے جب پنڈت نہرو اور فراق نہ تھے صرف اکبر اور امرود تھے اور طفیل صاحب نے آج کل کا ذکر کیا ہے جب اکبر نہیں ہیں پنڈت نہرو۔ فراق اور امرود ہیں۔

سید عابد علی کے متعلق مضمون لکھتے لکھتے طفیل صاحب کے ان فقروں نے چونکا دیا:

> ''مجھے ان سے یہ شکایت رہی ہے کہ اتنی ٹھوس شخصیت ہونے کے باوجود انہوں نے کوئی قابل ذکر ادبی کام نہیں کیا یہ ''فضیلت'' صرف ان ہی میں نہیں ہے بلکہ یہاں کی کئی اور بڑی بڑی شخصیتوں میں تھی اور ہے اگر میں اس سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر (بعض زندہ کرم فرماؤں کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے) کا نام لوں تو میرے کرم فرما مجھے معاف فرمائیں۔''

طفیل صاحب زندہ کرم فرماؤں سے ڈر جائیں مگر ان کا نام لیتا ہوں۔ ابھی چند ہی دن ہوئے کہ صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم کے گھر سید ذوالفقار علی بخاری نے یہی بحث چھیڑی تھی سید احمد شاہ بخاری پطرس کا علم و تبحر دیکھیے اور ایک کتابچہ دیکھیے ''پطرس کے مضامین'' اس قابلیت، اس ذہانت اور اس تبحر کے اہل قلم سے امید تھی کہ نہ جانے ادب اردو کو کیا کچھ دے دے گا۔ ڈاکٹر تاثیر اور چراغ حسن حسرت اپنی صلاحیتیں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ صوفی تبسم ہیں خدا کرے وہ اب بھی کوئی ادبی کارنامہ پیش کر دیں۔ سید عابد علی کی صحت اگر اجازت دے تو ان میں عزم بھی ہے ہمت بھی اور ان کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ خود اب تک کی غفلتوں کی تلافی کے لیے بے قرار ہیں۔ اس موقع پر ان کی صحت کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ عابد کے پاس بہت کچھ ہے اور ان کی نیت بھی بخل کی نہیں۔ دیر میں سہی مگر ان کی توجہ اس طرف ضرور ہوئی ہے اور امید ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر دکھائیں گے۔

آخری مضمون احسان دانش پر ہے اور بہت ہی کامیاب مصوری ہے۔ احسان اپنی تمام بے ساختگی اور تمام سادی پرکاری اور تمام پرکار سادگی کے ساتھ اس مضمون میں سمٹ آئے ہیں۔ ان کا بینک کی عمارت پر قبضہ کرنا۔ ان کا کبوتروں سے شغف۔ ان کی موت کے متعلق وہ اسکیم جو تقسیم ملک کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔ ان کا [illegible] سے شیخوپورے کی طرف فرار ان کے تاجور مرحوم سے مراد کی داستانیں اس حسن سے بیان ہوئی ہیں کہ طفیل صاحب پر محمد حسین آزاد کی افسانہ طرازی کا شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ مضمون بقول طفیل صاحب کے نامکمل بھی ہے اور ناکام بھی مگر احسان صاحب کا تو کام تمام کر ہی گیا ہے۔

رہ گئی اس کتاب کی زبان۔ اندازِ بیان اور باقی ادبی نزاکتیں ان کے متعلق خود مصنف کا دیباچہ پڑھ لینا کافی ہوگا جو ''اعترافِ جرم'' کے نام سے کتاب کے شروع میں دیا گیا ہے۔

○○

پنڈت مدن موہن مالوی

آپ مادر ہند کے معتبر ترین صاحب زادوں میں سے ایک ہیں ہندوستان کی قومی رہنمائی عرصہ دراز سے فرما رہے ہیں مگر جیل بہت کم تشریف لے گئے ہیں۔ سیاست اور مذہب دونوں کو سنبھالے رکھنا چاہتے ہیں یعنی ایک پیر سیاسی کشتی میں ہے اور دوسرا مذہبی ناؤ پر اور اس طرح آپ اپنی زندگی عبور کر رہے ہیں ہندوؤں میں بے حد ہر دل عزیز ہیں اور مسلمانوں میں ڈاکٹر مونجے اور بھائی پرمانند سے غنیمت سمجھے جاتے ہیں۔ بہر حال یہ تو طے ہی ہے کہ آپ پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح ہندوستانی نہیں بلکہ پہلے ہندو برہمن ہیں پھر ہندستانی ہیں۔

برہمن ہیں اور خطرناک قسم کے برہمن ہیں۔ لندن تک گنگا جل لے کر گئے تھے اور جہاز کے تختہ پر بھی آپ کی رسوئی کا علیحدہ انتظام تھا اور جیل میں بھی یہ احتیاط جاری تھی لیکن باوجود اس کے محض لندن جانے سے آپ کا دھرم مشکوک ہو گیا تھا۔ لہٰذا دریائے گنگا کے کنارے آپ نے دھرم کی ازسرِ نو تجدید کی تھی۔ راسخ الاعتقادی میں ایک طرف تو یہ شدت پسندی ہے، دوسری طرف گاندھی جی کی ہریجن تحریک ناک میں دم کیے ہوئے اور گاندھی جی سے نہ تو انحراف ہو سکتا ہے نہ دھرم کو اس طرح تباہ کیا جا سکتا ہے۔ ہریجنوں سے جہاں تک زبانی ہمدردی اور قومی بھائی چارہ کا تعلق ہے وہاں تک تو غنیمت ہے لیکن نہ تو آپ روٹی بیٹی کے اس سلسلہ میں قائل ہیں نہ اس کے قائل ہیں کہ ہریجنوں سے معانقہ یا مصافحہ قسم کی بے تکلفی شروع کر دی جائے اس لیے کہ یہیں سے تو "رام رام رام" کا قصہ شروع ہو جاتا ہے اور گئو متر کی

ضرورت محسوس ہوتی ہے لہٰذا آپ نہیں چاہتے کہ گوبر اور گئو مُتر سے پاک بنائے ہوئے دھرم کو اچھوتوں کی وجہ سے نشٹ کریں اور ملیچھوں سے بھائی چارہ کر کے ملیچھ بن جائیں۔

آپ ویسے بہت زیادہ قابل، بہت زیادہ سمجھ دار اور بہت زیادہ اچھے آدمی ہیں البتہ بس یہی دقیانوسیت اور مذہبی شدت پسندی نہ ہوتی تو کیا کہنا تھا۔

سفید مونچھیں ہیں سفید لباس پہنتے ہیں اور سر سے پیر تک کالا آدمی ہونے کے باوجود سفید فارم رہتے ہیں، تقریر بھی خوب کرتے ہیں مگر جیل والے نکات سے بچا بچا کر، تحریر بھی ماشاء اللہ اچھی ہے۔ ہندو یونیورسٹی کے آپ سر راس مسعود ہیں۔ بنارس کے رہنے والے ہیں لہٰذا پنڈت جی بنارسی بھی کہلاتے ہیں۔ جہاں تک خود ہماری ذات کا تعلق ہے، ہم پنڈت جی کے اس چھوت چھات کو بھی اچھا سمجھتے ہیں اور راسخ الاعتقادی کی بھی قدر کرتے ہیں بشرطیکہ وہ وسیع النظر اور روشن خیال وغیرہ ہونے کا دعویٰ نہ کریں۔

○○

تعزیت

ریاض کے والد بزرگوار نے انتقال فرما کر ایک عجیب سوال پیدا کر دیا تھا کہ والدین کو اولاد کا غم شدت کے ساتھ ہوتا ہے یا اولاد کو والدین کا غم؟

ماشاء اللہ ایک سو پانچ یا ایک سو چھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا تھا لیکن ریاض کا یہ حال تھا کہ مچھلی کی طرح تڑپتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوان اولاد کا داغ کھایا ہے۔ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ اگر اولاد اپنے والدین کا غم منانے پر تل جائے تو والدین کا داغ بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بیٹے یا بیٹی کے مرنے سے والدین یتیم نہیں ہوتے لیکن باپ کے مرنے سے اولاد یتیم خانے میں داخل کر دی جاتی ہے اولاد کے مرنے کے بعد انسان اپنی دوسری اولاد کو دیکھ کر صبر کر لیتا ہے ورنہ کم سے کم یہ امکان تو ضرور ہوتا ہے کہ خداوند کریم اور دے گا۔ لیکن سوال ہے کہ ریاض بے چارے اپنے لیے والد کا انتظام کیوں کر کرتے۔ ان کو یہی غم تھا کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو بغیر باپ کے رہنا پڑے گا۔ ماں کے غم سے وہ واقف نہ تھے اس لیے کہ وہ غریب ان ہی حضرت کی پیدائش کے سلسلے میں دنیا سے کوچ کر چکی تھیں اور ان کو ان ہی کے ایک عدد مرحوم والد بزرگوار نے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا تھا لہذا ان کی ماں تھے تو وہی اور باپ تھے، تو وہی جن کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ کے لیے ان سے جدا کر دیا تھا۔

ریاض کے والد ماجد کا انتقال خود ان کے لیے تو غم کا پہاڑ پھٹ پڑنے کے برابر تھا ہی

لیکن اس سلسلہ میں ہم بھی کچھ کم مصیبت میں مبتلا نہ تھے اس لیے کہ بحیثیت دوست کے ہم کو ریاض کے پاس تعزیت کے لیے جانا تھا ان سے اظہار ہمدردی کرنا تھا جنازہ میں عدم شرکت کے عذر کرنا تھے وغیرہ وغیرہ لیکن ہم اس سے قطعاً ناواقف تھے۔ ہم کو اس سلسلہ میں کیا کیا کرنا ہوگا۔ زندگی بھر میں پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی تھی اور وقت اتنا تھا نہیں کہ ہم تعزیت کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچا کر تھوڑی بہت مشق کر لیں۔ بہر حال ہم کو اتنا اطمینان تو تھا ہی کہ ہم بالکل کورے ثابت نہ ہوں گے اس لیے کہ متعدد مرتبہ لوگ ہمارے پاس تعزیت کے لیے آچکے تھے اور متعدد مرتبہ ہم نے دوسرے لوگوں کو آپس میں یہی مشکل کام انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگرچہ کچھ ہم کو جھجک تھی تو صرف اس لیے کہ خود ہم نے بہ نفس نفیس آج تک یہ رسم ادا نہ کی تھی لیکن اس سے کیا ہوتا ہے جانا اور تعزیت کرنا تقریباً ناگزیر تھا۔ لہٰذا ہم نے اللہ کا نام لے کر اپنے ارادہ کو پختہ کر لیا اور مختلف اوقات میں جو تعزیتی الفاظ ہمارے کانوں میں پڑ چکے تھے ذہن پر زور دے کر یکجا کرنے شروع کر دیئے۔

"مشیت ایزدی میں کیا چارا ہے .... صبر کیجیے .... جس کی چیز تھی اس نے لے لی .... دنیا کا یہی دستور ہے .... مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے .... کیا علیل ہوئے تھے .... ہم کو بھی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے ...... آج وہ، کل ہماری باری ہے .... خدا بخشے عجیب، انسان تھے .... دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے ... ... کوئی نشانی بھی چھوڑی ہے .... "ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد" .... مگر صبر کیجیے .... رونے سے کیا ہوتا ہے۔ ہر ایک دن آنے والا ہے .... دنیا سرائے فانی ہے۔ کیا اخلاق تھا مرحوم کا ہر ایک خوش .... کبھی نماز قضا نہیں گئی .... خدا نعم البدل دے گا .... اپنے جینے کو سنبھالیے .... صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے .... حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے .... بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں .... ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن الٰہی عاقبت محمود گرداں .... چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔

ہمارے پاس تعزیتی الفاظ کی کمی تھی لیکن آسان سے آسان کام جب تک انسان کر نہ لے اس کے لیے مشکل بنا رہتا ہے۔ بہرحال اب تو ہم کو اس دشواری سے دوچار ہونا ہی تھا لہٰذا ہم نے ان الفاظ کو ترتیب وار دماغ میں محفوظ کر لیا اور ان کی مشق کرنے کے بعد ہم ''ایکسپرٹ'' ہو گئے تو نصف اطمینان اور نصف بے اطمینانی کی حالت کے ساتھ گھر سے اس طرح چلے، گویا یونیورسٹی کے کسی امتحان میں بیٹھنے کے لیے جا رہے ہیں۔ راستے بھر تعزیتی الفاظ رٹتے رہے اور آخرکار ہماری تعزیتی تقریر کچھ اس طرح تیار ہوگئی:

> ''مجھ کو تو کل اطلاع ہوئی واللہ دل کو یقین نہیں آتا عجیب سانحہ ہے، عجیب حادثہ ہے، خداوند کریم آپ کو صبر دے اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، کیا علیل تھے؟ ہر ایک خوش، کبھی نماز قضا نہیں کی...... بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں، صبر کیجیے، کیا اخلاق تھا مرحوم کا، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، آپ کی قسمت میں یہ غم لکھا تھا حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔ جس کی چیز تھی اس نے لے لی۔ ''ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد''........ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے روحیں آزاد نہ ہوں جسم جو برباد نہ ہوں ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن مریں گے تو سانچے میں ڈھل جائیں گے، وہ جنت کا اک پھول تھے ...... حوروں کی گود میں ہوں گے، نمازی، پرہیزگار، خوش وضع، خوش اخلاق، دوست نواز، غریب پرور، نیک، سچے، فرشتہ صفت، محبت کرنے والے لائق، پڑھے لکھے، فخر خاندان، مختصر یہ کہ خدا آپ کو صبر کی توفیق دے، خدا آپ کو نعم البدل عطا فرمائے، خدا آپ کا غم غلط کرے مجھ کو اطلاع ہوتی تو شاید کچھ کام آتا۔ مٹی دینے میں شرکت کرتا، نماز جنازہ میں شریک ہو جاتا، مگر افسوس کہ ''آج وہ کل ہماری باری ہے، چلیے،

اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ السلام علیکم۔"

ریاض کے دروازہ پر پہنچ کر ارادہ ہوا کہ "خط لے جایئے۔" کی آواز دیں لیکن یاد آ گیا کہ موقع غم کا ہے۔ فوراً اپنا چہرہ اداس بنا لیا اور مری ہوئی آواز سے پکارا۔ "ریاض صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" آواز کے ساتھ ہی ملازم برآمد ہوا اور ہم کو اپنے ہمراہ گھر میں لے گیا جہاں ایک کمرے میں ریاض اوڑھے لپیٹے پڑے تھے۔ ہم نے مضمحل آواز میں کہا۔

"السلام علیکم"

انہوں نے اس کے جواب میں "والے گم۔ اس سالام" کہہ کر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ہمارا بھی دل بھر آیا۔ لیکن یہ موقع ہمارے رونے کا نہ تھا ہم تعزیت کے لیے آئے تھے لہذا ہم کو جلد سے جلد اپنی تعزیتی تقریر شروع کرنا تھی۔ ہم نے جلد جلد دل ہی دل میں تقریر دہرانا شروع کی، لیکن ریاض رو رو کر کچھ ایسے ہاتھ پیر پھیلائے دیتا تھا کہ ہم اپنی تقریر بھولے جا رہے تھے۔ لاکھ لاکھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن، اس کی ہر ہچکی خیالات منتشر کر دیتی تھی اور ہم پھر شروع سے تقریر یاد کرنے لگتے تھے، جب اسی میں بڑی دیر ہو گئی تو ہم نے اپنی خاموشی پر غور کیا کہ یہ تو بڑی بری بات ہے کہ وہ تو روتے روتے جان دیئے دیتا ہے اور ہم چپ بیٹھے ہیں۔ مجبوراً ہم نے طے کر لیا کہ کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہیے جو اس خاموشی سے یقیناً بہتر ہوگا لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کہیں۔ کہنے کو تو ہم سب کچھ کہہ سکتے ہیں بس بات شروع ہونے کی دیر تھی، لہذا یہی سوچ رہے تھے کہ شروع کس طرح کریں، چوں کہ یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا، لہذا اس پر غور کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا اور ہم نے جو حساب لگایا تو یہ غور و فکر کا وقت اور وہ غور و فکر اور تقریر یاد کرنے کا عرصہ اپنی میزان کل پر آ کر آدھ گھنٹے کے قریب ہوتا تھا ہم نے کہا۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ تعزیت کے لیے آئے ہیں اور آدھ گھنٹے سے بت بنے بیٹھے ہیں لہذا دماغ پر زور دے کر تعزیتی الفاظ کو از سر نو یاد کیا اور آنکھیں بند کر کے بھر آئی ہوئی آواز میں کہا:

"آپ کے والد ...." پھر سوچا کہ اب کیا کہیں؟ کچھ یاد آ گیا تو عرض کیا۔

"آپ کے والد .... "ہم کو خود یاد نہیں رہا کہ ہم کو کیا یاد آیا تھا مگر ٹھیک ہے وہ بات یہ تھی کہ:

"آپ کے والد .... آپ کے والد .... آپ کے والد .... خدا جانے ہم کیا کہنا چاہتے تھے، دماغ میں جیسے کم بخت گوبر بھرا تھا۔ آخر دماغ نے کام نہ دیا لیکن مناسب یہی معلوم ہوا کہ کچھ کہہ چلو، لہٰذا ہم نے پھر کہنا شروع کیا:

"آپ کے والد .... آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔

ریاض نے یہ سنتے ہی پھر ایک چیخ اس طرح ماری گویا اس کو انتقال کی خبر میں نے ہی سنائی ہے۔ میں پھر خاموش ہو گیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھ کو یاد آیا کہ مجھ کو خاموش نہ ہونا چاہیے لہٰذا میں نے جلد جلد کہنا شروع کیا:

> "آپ کے والد کا انتقال ہو گیا، آپ کے والد مرحوم کو خدا صبر کی توفیق دے اور آپ کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ کبھی نماز نہیں قضا ہوئی۔ زندگی بھر روزے رکھتے رہے آپ کے والد مرحوم، مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے، صبر کیجیے، اب رونے سے کیا ہوتا ہے اور آپ کے والد .... آپ کے والد .... آپ کے والد .... آپ کے والد .... جس پہ گذری ہو یہ وہی جانے مگر اب نہ رویے .... جانے بھی دیجیے .... ہٹائیے بھی اس قصہ کو .... آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

میری تقریر سے ریاض کو تسکین ہو رہی تھی، وہ روتے روتے خاموش ہو گیا تھا اور گردن جھکائے بیٹھا خاموشی کے ساتھ میرے الفاظ سن رہا تھا بلکہ کبھی کبھی میرے زوردار الفاظ پر گردن اٹھا کر میرے منہ کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اب میرے بھی حواس درست تھے اور میں نہایت مناسب طریقہ پر تعزیتی تقریر کر رہا تھا۔ میں نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا:

"باپ بھی دنیا میں عجب نعمت ہے۔ بہت سے بے چارے اس

ارمان میں مرے جاتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر خدا دے تو زندگی بھر کا دے نہیں تو اس سے نہ ہونا ہی اچھا ہے۔''

ریاض برابر میرا منہ دیکھے جا رہا تھا، لیکن میرے اس جملہ کا اس پر خاص اثر ہوا اور اس نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر میرے چہرہ پر جمادیں۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ کھنکھار کر پھر کہنا شروع کیا:

''اب وہ واپس تو آ نہیں سکتے، مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے ہم کو بھی ایک دن اسی طرح تصویر کھچانا، یعنی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے۔ خدا بخشے عجیب انسان تھے۔ دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے، مجھ کو تو کل خبر ہوئی، آج وہ کل ہماری باری ہے۔ ورنہ مجھ کو اطلاع ہوتی تو میں کچھ کام آتا اور بفرض محال یعنی کہ مٹی میں شرکت ہو جاتی، نماز جنازہ تو ضرور ہوئی ہو گی۔''

ریاض نے منحنی آواز میں جواب دیا:

''جی ہاں فرنگی محل میں مولانا عنایت اللہ صاحب نے پڑھائی تھی۔''

میں: ''خیر یہ بھی اچھا ہوا اور خدا آپ کو ضرور صبر دے گا اور قبر کا کیا ہوا ہو گا۔''

ریاض: ''عیش باغ کے نئے چمن میں مناسب جگہ لے لی تھی۔''

میں: ہاں! واقعی اور تم بے چارے کیا کرتے تمہارے حواس خود ٹھیک نہ ہوں گے، دنیا سرائے فانی ہے، کیا اخلاق تھا مرحوم کا اور بیماری کیا تھی؟''

ریاض: ''ارے بیماری کیا ضعیفی خود ایک مستقل بیماری ہے۔''

میں: ''ہاں بڑی مہلک بیماری ہے، خدا سب کو محفوظ رکھے۔ ہمارے بھائی صاحب کا چھوٹا بچہ اسی میں ضائع ہوا۔ کم بخت اب تو عالم گیر ہوتی جاتی ہے، غم کا پہاڑ پھٹ پڑا، بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں اور مرحوم نے کوئی نشانی بھی چھوڑی؟''

ریاض: ''ایک تو میں ہی ہوں۔''

میں (جلدی سے): ''تم تو خیر ہو ہی مگر میں نے کہا شاید اور بھی ہوں ارے ہاں کیا تعجب ہے؟''

ریاض: ''جی ہاں دو بھائی اور ایک بہن اور ہے۔''

میں: ''وہی مطلب ہے میرا اور ان کی بیوی کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے نا؟''

ریاض: ''جی ہاں! میری والدہ تو عرصہ ہوا۔ یعنی میری پیدائش کے وقت ہی انتقال کر گئی تھیں اور میری دوسری والدہ بھی چھ سال ہوئے رحلت فرما گئیں جن کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔''

میں: ''ان کے انتقال کا بھی سخت افسوس ہوا مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ، صبر کیجیے اور آپ کے والد ماجد کی ماشاء اللہ کیا عمر تھی؟''

ریاض: ''سو سے کوئی پانچ چھ سال اوپر تھے۔''

میں: ''افسوس صد افسوس! حسرت ان غنچوں پہ ہے''

ریاض نے مجھ کو کچھ اس نظر سے دیکھا جیسے میں دنیاداری کر رہا ہوں اور یہ سب صنع ہے مگر میں نے موثر انداز میں کہا:

''خدا گواہ ہے کہ چچا جان مرحوم مجھ کو بھی بالکل آپ ہی کی طرح سمجھتے تھے اور محبت کرتے تھے۔''

ریاض: ''جی ہاں ان کا ہر ایک کے ساتھ یہی سلوک تھا۔''

میں: ''ارے بھائی میں نہ جانتا ہوں تو مجھ سے کہو۔ میں تو یہ کہتا ہوں خدا ایسا لائق باپ ساری دنیا کو دے، ہر ایک خوش، کبھی نماز قضا نہیں کی، ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن۔ خدا جانے کس کی نظر کھا گئی۔ تو سب سے بڑے آپ ہیں؟''

ریاض: ''جی ہاں، اب تمام ذمہ داری میرے ہی سر ہے۔''

میں: ''گھبرائیے نہیں، جس خدا نے ان کو اٹھایا ہے، وہی آپ کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرے گا، دنیا سرائے فانی ہے۔ عجب ذات شریف تھے، مرحوم کبھی نماز قضا نہیں کی خود ان

ہی کی قضا آ گئی:

این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

دنیا کا یہی دستور ہے، دنیا سرائے فانی ہے، ایک آتا ہے۔ ایک جاتا ہے اور آپ کی شادی تو ہو چکی ہے نا؟"

ریاض: "جی ابھی تو نہیں ہوئی۔"

میں: (بزرگانہ اور تجربہ کارانہ انداز سے) بھائی تو اسی سلسلہ میں اس فرض سے بھی ادا ہو جاؤ۔"

ریاض: "اس کا یہ کون سا موقع ہے بھلا۔

میں: تو اب اور کون سا موقع آئے گا؟

ریاض: اب تو خوش ہونے والا کون ہے، جو تھے وہی نہیں رہے تو اب کیا ہوگی شادی۔

میں: ہاں یہ تو سچ کہتے ہو کہ چچا جان مرحوم کو چاہیے تھا کہ اس خوشی کو دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوتے مگر بھائی خوش ہونے والے ہم لوگ موجود ہیں۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے، جس کی چیز تھی اس نے لے لی۔ مگر بھائی شادی میں اب دیر نہ کرو۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔"

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

خدا جانے کل کیا ہونے والا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ:

سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

اب دیکھو نا چچا میاں مرحوم کو بے چارے آخر کیا بیمار تھے۔ یہی نا کہ بس قضا آ گئی ورنہ کہیں مرنے کے آثار تھے؟ کسی کو شبہ بھی ہوتا تھا کہ مر جائیں گے؟ مگر خدا کی مصلحت اور تم پر تو وہ جان دیتے تھے۔ اب تم کو کون اس طرح چاہے گا، تمہارا محبت کرنے والا اٹھ گیا، تم یتیم ہو گئے۔ تم پر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا:

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے

ریاض نے پھر ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا اور میں گھبرایا کہ اب کس طرح سمجھاؤں، تمام الفاظ ختم ہو چکے، کیا ان ہی کو پھر سے شروع کر دوں لیکن اگر انہوں نے بعد

میں پھر رونا شروع کیا تو کیا ہوگا۔ آخر کار دل نے کہا کہ بس اب بھاگو ورنہ یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا۔ مگر دل نے دوسری بات کہی کہ اس طرح رونے کے لیے تو تمام عمر پڑی ہے اور ان شاء اللہ تم سینکڑوں برس تک زندہ رہ کر روتے رہوگے، مگر یہ وقت رونے کا نہیں ہے تم کو مجھ سے کام لینا چاہیے۔

ریاض کی ہچکیاں، سسکیاں بن گئیں اور سسکیاں بھی تھوڑی دیر کے بعد بند ہو گئیں تو میں نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ ”اچھا بھائی اب اجازت دو۔“

ریاض کے یہاں سے آکر مجھ کو پورا اطمینان تھا کہ اور اب میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس کے یہاں کہیے تعزیت کے لیے روز چلا جایا کروں۔

* * *

ب

اب میں کیا کہوں ان پنڈت جی کو جنہوں نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا کہ ”ب“ کا حرف تمہارے لیے نہایت نحس ہے۔ تمہاری موت کا خواہ کوئی بھی سبب ہو، مگر وہ سبب ہوگا ”ب“ سے لہٰذا ہر اس چیز سے بچو جس کا نام ”ب“ سے شروع ہوتا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک حرف تھا مگر جب احتیاط شروع کی تو پتہ چلا کہ یہ ”ب“ اس قدر عالم گیر ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ بجلی خواہ وہ بادل میں چمکے یا گھریلو روشنی کی صورت میں ہو خوف ناک بن گئی۔ بندوق، بارود، بندر، بن مانس، بچھو وغیرہ تو خیر ہیں ہی بے ہودہ چیزیں، مگر بہن، بھائی اور بیوی تک سے جو شخص مطمئن نہ رہ سکے، بھتیجوں اور بھانجوں سے جس کو ہر وقت اندیشہ ہو۔ برفی ایسی مٹھائی نہ کھا سکے۔ گرمیوں میں برف سے پرہیز کرے بھوپال اور بمبئی کے نام سے گھبرائے اور کراچی پہنچ کر جس کو یہ خیال ستائے کہ یہ بھی تو بندرگاہ ہے بائیسائیکل دیکھ کر جس کا خون خشک ہو جایا کرے اور سوتے سوتے جو شخص بستر الٹ کر کھری چارپائی پر لیٹنے کو ترجیح دے۔ بدرالحسن ایسے دوست اور بخاری ایسے کرم فرما سے الجھن ہو۔ بچوں کو دیکھ کر جسے وحشت ہونے لگے اور بائیسکوپ جسے ترک کر دینا پڑے اس کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ دل کو جیسے یقین سا تھا کہ تاریخ وفات کسی سال میں بھی ہو مگر یہ طے ہے کہ دسمبر کی بارہ یا بیس یا بائیس ضرور ہوگی۔ اس لیے کہ دسمبر سال کا بارہواں مہینہ ضرور ہوتا ہے اور ہر مہینے میں یہ تین تاریخیں ایسی ہوتی ہیں جو ”ب“ سے ہوں۔ سنہ باون کے شروع ہوتے ہی صدقہ خیرات شروع ہوا اور یہ احتیاط رکھی گئی کہ صدقہ کے لیے بکرا نہ آئے مینڈھا آئے تو کوئی مضائقہ نہیں ورنہ دنبہ آجائے۔ اگر یہ صدقے قبول ہو گئے اور سنہ باون کا بارہواں مہینہ اور اس کی بارہ بیس اور بائیس تین تاریخیں

خیریت سے گزر گئیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ سنہ باسٹھ تک کی تو گویا مہلت مل ہی جائے گی مگر مہلت کیا خاک مل جائے گی۔ ہجری سنہ کے بارہویں مہینے میں بھی یہ تین تاریخیں تو پڑتی ہی رہتی ہیں اور بکری سنہ کی تو ہر تاریخ خطرناک ہوتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی اس ”ب“ سے بچ کر کہاں جائے۔ اب آپ کو یقین نہ آئے گا ہر سال عید تو خیر عید ہوتی ہے۔ مزے سے گزر جاتی ہے مگر بقرعید قیامت بن کر آتی ہے۔ خدا خدا کر کے جب یہ تہوار گزرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پھر سے پیدا ہوئے ہیں مگر اس ”ب“ سے بعض اوقات ایسی مڈبھیڑ ہوتی ہے کہ اب کیا عرض کیا جائے مثلاً حال ہی میں جو واقعہ ہوا ہے وہ ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ یہ تو میں عرض کر ہی چکا ہوں کہ سنہ باون مجھ پر بھاری ہے۔ دسمبر یعنی اس سال کا بارہوں مہینہ تو خیر ابھی دور ہے مگر میں ہر مہینے بارہ بیس اور بائیس تاریخ کو روزہ رکھ لیتا ہوں، احتیاطاً اور ذرا نماز بھی علی الحساب پڑھنے لگتا ہوں۔ اس کے علاوہ ہر دن اور ہر رات کے بارہ بجے ذرا ہوشیار سا ہو جایا کرتا ہوں۔

گزشتہ اپریل میں یوم اقبال اطراف ملک میں منایا گیا۔ خیریت یہ ہے کہ یوم اقبال اکیس تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ یعنی دو خطرناک تاریخوں کے بیچوں بیچ، بہرحال مجھ کو اکیس تاریخ پر ذاتی طور پر خاص اعتراض نہیں ہے مگر چوں کہ تمام اطراف ملک کے لیے ایک ہی تاریخ ناکافی ہے۔ لہٰذا تصادم کے خوف سے لوگ مختلف تاریخوں میں بھی یوم اقبال منایا کرتے ہیں، چناں چہ کچھ نوجوان دعوتی رقعے لے کر میرے پاس آئے معلوم ہوا کہ بزم ادب بادامی باغ کے کارکن ہیں جس کے زیر اہتمام بیس اپریل کو یوم اقبال کے سلسلہ میں مشاعرہ ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ میں بھی شرکت کروں۔ دعوت نامہ دیکھ کر خون ہی تو خشک ہو گیا ”ب“ کی بھرمار تھی۔ بزم ادب میں ”ب“ ”بادامی“ میں ”ب“ ”باغ“ ”ب“ پھر بیس تاریخ۔ دل نے کہا برخوردار یہ موت کا پروانہ ہے۔ گئے نہیں کہ قصہ پاک ہوا سینکڑوں بہانے کر کے ان کو ٹال دیا۔ بائیس اپریل کو بھی ایک مشاعرہ تھا اس سے بھی نجات حاصل کر کے مگر چوبیس تاریخ کو ایک تقریب محفوظ نظر آئی۔ چناں چہ شرکت کا وعدہ کر لیا۔ شہر کے باہر جانا تھا کہ تاریخ چوں کہ محفوظ قسم کی تھی لہٰذا روانگی کے انتظامات مکمل کر لیے۔ ایک معمولی سی احتیاط یہ ضرور کی کہ جو صاحب مدعو کرنے

آئے تھے جب وہ لینے کو آئے تو ان سے عرض کر دیا کہ صاحب میں اصولاً بس میں سفر نہیں کرتا یا موٹر کا انتظام کر لیجیے یا ریل سے چلیں گے۔ وہ ریل کے چلنے پر راضی ہو گئے مگر اب یہ اتفاق ملاحظہ ہو کہ ریل کا وقت بارہ بج کر بیس منٹ تھا۔ ظاہر ہے یہ ریل بھی ایک قسم کی بس ہی ہوئی۔ موٹر کی ان کے بجٹ میں گنجائش نہ تھی اور نہ یہ بات ان کو آسانی سے سمجھائی جا سکتی تھی کہ بارہ بج کر بیس منٹ پر روانہ ہونے والی ٹرین سیدھی عدم آباد جاتی ہے۔ سوال یہ تھا کہ اب آخر کریں تو کیا کریں، ارادہ کیا کہ اختلاج قلب کا ایک شدید دورہ فوراً تصنیف کیا جائے تاکہ یہ صاحب خود ہی نہ لے جائیں مگر دورہ شروع ہی ہوا تھا کہ وہ صاحب حکیم بن گئے ایک نعرہ بلند کیا، ارے بھائی کوئی ہے فوراً بید مشک اور برف کا انتظام کیا جائے۔ لیجیے یک نہ شد دو شد بید مشک اور برف زہرا اور وہ بھی آتشہ نسخے کے دونوں اجزا میں "ب" فوراً اس دورے کو ملتوی کرنا پڑا اور ان سے عرض کیا کہ میں ٹھیک ہو گیا ہوں مگر اس حالت میں فوراً سفر پر روانہ ہونا مناسب نہیں ہے وہ بھی آدمی معقول نکلے۔ ٹائم ٹیبل دیکھ کر بولے مناسب ہے۔ دوسری گاڑی دو بج کر پندرہ منٹ پر جاتی ہے لہٰذا اس ٹرین سے روانہ ہو گئے اور جب گاڑی چل دی تو وہ ٹریجڈی شروع ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ، اب تک تو کچھ رسمی تکلفات کی وجہ سے کچھ اختلاج کے دورے کی وجہ سے ان حضرت سے تفصیلی گفتگو ہی نہ ہوئی تھی۔ اب جو ٹرین میں اطمینان سے بیٹھے تو ان حضرت سے کہا:

"بھئی معاف کیجیے گا میں نے اب تک یہ بھی نہیں پوچھا کہ جناب کا اسم مبارک کیا ہے۔"

وہ کھیسیں نکال کر بولے "بندے کو بشیر بیگ کہتے ہیں:

ایک دم جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا۔ بشیر اور پھر بیگ۔ سفر میں ایک چھوڑ دو "ب" ساتھ ہیں، یہاں یہ احتیاط کہ بیگ یا بکس یا بستر تک ساتھ نہیں لیا تھا کیا معلوم تھا کہ بستر اور بیگ کے بجائے بشیر بیگ مل جائیں گے گھبرا کر پوچھا اور تخلص کیا فرماتے ہیں جناب خیال آیا کہ تخلص ہی کے سہارے یہ سفر طے کر لیں گے۔ ان حضرت نے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا: بسمل کہتے ہیں خاکسار کو۔"

جی چاہا کہ خطرے کی زنجیر کھینچ لیں۔ یعنی بدتمیزی ملاحظہ ہو کر تخلص تک آپ کو "ب" کے علاوہ کوئی نہ ملا بے وقوف کہیں کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ ضرور سفر آخرت ہے اور یہ شخص جس کے ایک ہی نام میں تین "ب" موجود ہیں یقیناً ملک الموت ہے۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جو بقر عید کے دن ہر مہینے کی بارہ، بیس اور بائیس تاریخوں کو یا ہر روز کے بارہ بجے اور ہر رات کے بارہ بجے طاری ہوا کرتی ہے۔ ان حضرت کو میرے محسوسات کی کیا خبر۔ آپ نے میری دلچسپی کے لیے اپنے بیگ سے تاش نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے اور نہایت بے تکلفی سے بولے "رمی جانتے ہیں آپ" اب میں ان سے کیا کہتا کہ تاش کا شوق پنڈت جی نے جس دن سے ہاتھ دیکھا ہے ایسا چھوٹا ہے جیسے کبھی تاش کھیلتے ہی نہ تھے اب یہ باون پتوں والا خوف ناک کھیل کون کھیلے۔ میں نے نہایت عاجزی کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے ان کو دوسری باتوں میں لگانا چاہا:

"آپ غالباً اس طرف کے رہنے والے تو نہیں ہیں۔"

وہ تاش کے پتے پھر پھراتے ہوئے بولے:

"جی نہیں میں تو پاکستان بننے کے بعد حاضر ہوا ہوں ورنہ غریب خانہ تو بسواں بریلی ہے۔"

انا للہ وانا الیہ راجعون غریب خانہ بھی اس بے ہودہ نے چھانٹ کر وہاں کا رکھا ہے جہاں ایک چھوڑ دو "ب" ہوں یہ شخص ضرور آج کوئی حادثہ کرائے گا۔ ارادہ کیا کہ اب کافر ہو جو اس سے بات بھی کرے مگر اس کا کیا علاج کہ وہ حضرت خود ہی بولے:

ویسے زیادہ تر رہنے کا اتفاق ہوا ہے بسواں۔"

گھبرا کر عرض کیا "یہاں جناب کا کیا شغل ہے؟"

نہایت مسکین صورت بنا کر کہا "بے کاری۔"

دیکھیے کتنا محفوظ سوال تھا مگر کس قدر تشویش انگیز جواب دیا ہے اس نامراد نے مشاغل میں بہت کم ایسے ہوں گے جو "ب" سے شروع ہوتے ہوں تاوقتیکہ آدمی بدمعاش، بندر والا۔ بندوقچی، بہروپیہ، بساطی، بکر قصاب، برق انداز وغیرہ نہ ہو یا پھر بیرسٹر ہو "ب" والا پیشہ ڈھونڈھ کر بتانا آسان کام نہیں ہے۔ اب تو یہ بھی پوچھنا خطرے سے خالی نہ تھا کہ ہجرت سے

پہلے جناب کیا شوق فرماتے تھے۔ فرض کر لیجیے وہ کہہ دیں کہ بینڈ ماسٹر تھا میں، تو میں ان کا کیا کر لوں گا۔ میں نے دراصل ان سے ڈر کر اپنی توجہ باہر کے مناظر کی طرف مبذول کر دی اور کھڑکی سے باہر منہ نکال کر ان حضرت سے اپنے نزدیک محفوظ ہو گیا۔ اب وہ لاکھ کچھ کہیں میں ہوں۔ ہوں نا۔ نہیں میں مختصر جواب دیتا اور ان کو ٹالتا رہا۔ آخر وہ نہایت بے تکلفی سے میری ہی سیٹ پر آ کر بولے:

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

بدمعاشی دیکھی آپ نے غالب کا شعر بھی وہ چھانٹا ہے جو ''ب'' سے شروع ہوتا ہے جیسے اس شخص نے میری چڑھ مقرر کر لی ہو۔ میں نے ان حضرت سے کہا بات یہ ہے کہ میں کچھ شعر کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کے مشاعرے کی طرح میں۔''

کہنے لگے: ''صاحب طرح تو بہت شگفتہ ہے:

میں نے دامن جسے سمجھا تھا گریباں نکلا

مگر اس زمین کو تو غالب ختم کر گیا یہ شعر کہہ کر کہا:

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

پھر ''ب'' والا شعر، شعر اچھا ہے تو ہوا کرے۔ کس کام کا وہ شعر جو ''ب'' سے شروع ہوا ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طرح سے طبیعت اچاٹ ہو کر رہ گئی اور میں نے گھبرا کر کہا ''دوسری طرح بھی تو ہے:

وہ کہنے لگے۔ جی ہاں دوسرا مصرع ہے:

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

اور میرا دل دھک سے رہ گیا کہ اب یہ غالب کا شعر پڑھتے ہیں کہ:

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ لاحاصل میں ہے

مگر شکر ہے کہ ان کو یہ شعر پڑھنے کا موقع نہ ملا اور ایک اسٹیشن پر گاڑی کھڑی ہی ہوئی تھی کہ وہ حضرت بولے ”یہاں کی بالائی بہت مشہور ہے دیکھیے ابھی کھلاتا ہوں۔

حالاں کہ اس نامعقول کو واقعی کھلانا ہوتی تو ”ملائی“ کہتا ”بالائی“ نہ کہتا میں اس کو یہ تو نہ سمجھا سکا کہ میں نے ہمیشہ ”بالائی“ کو ”ملائی“ سمجھ کر کھایا ہے مگر وہ ملائی کو بالائی کہہ کر میرے لیے خطرناک بنا رہا تھا۔ بہر حال میں نے عذر کر دیا کہ یہ چیز نہیں کھاتا اور وہ خود نہایت بدتمیزی سے سچ مچ کی ”ملائی کھا رہا تھا اور محض مجھ سے بچانے کے لیے اس کو ”بالائی“ کہتا جا رہا تھا مگر جب اس نے دام دیتے ہوئے بارہ آنے گن کر دیے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ بالائی نہ سہی مگر تھی تو بارہ آنے کی یہ تو بالائی تھی جس شخص نے باپ کو ہمیشہ والد سمجھا ہو۔ بیٹے اور بیٹی کو ہمیشہ لڑکا اور لڑکی مانا ہو وہ ذرا سی بالائی پر اپنے اس دیرینہ اعتبار کو کیوں کر قربان کر دیتا۔ بہر حال خدا خدا کر کے اس اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہو ہی رہی تھی کہ یہ حضرت ایک انگلی اٹھا کر چیخے وہ دیکھیے بارہ سنگھا کاش ان کو معلوم ہوتا کہ وہ خود بھی مجھے بارہ سنگھے ہی نظر آ رہے تھے خیر یہاں تک تو سب کچھ برداشت کیا مگر ہوش تو اس وقت اڑے ہیں جب ان حضرت نے بر سبیل تذکرہ فرمایا اس مشاعرے کے لیے بارہ دری سے بہتر مقام مشکل ہی سے مل سکتا تھا اور بارگاہ سجائی گئی ہے کہ باید و شاید۔ ایک تو بارہ دری میں مشاعرے دوسرے اس میں بارگاہ سجائی گئی ہے اور وہ بھی ایسی کہ باید و شاید نہیں صاحب یہ مشاعرہ تو زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔ جہنم میں گیا مشاعرہ اور لعنت ہے اس شاعری کے شوق پر، جان ہے تو جہان ہے۔ شکر ہے کہ راہ فرار بھی مل گئی اگلے ہی اسٹیشن پر لاہور آنے والی گاڑی سے میل ہوتا تھا کہ میں ٹہلنے کو نکلا اور دور تک نکل گیا اس گاڑی تک آ گیا جو لاہور کے لیے رینگ رہی تھی اور جست کر کے ایک ڈبے میں سوار ہو گیا کھڑکی سے گردن نکال کر دیکھا کہ بارہ سنگھا اس ٹرین کی طرف دوڑ رہا تھا چغد کہیں کا۔

○○

بخیالِ خویش خبطے

اللہ جانے یہ مولوی نور اللہ ہمارے کن گناہوں کا عذاب ہیں؟

ہزار مرتبہ سمجھایا کہ مولانا چاہے جیسی قسم لے لیجیے پاکستان صرف ہم نے نہیں بنایا ہے اور نہ اس کے آئین کے ذمہ دار ہم ہیں۔ ہمارا قصور اگر ہے تو صرف اتنا کہ پاکستان کا نعرہ بلند کرنے میں ہم ضرور شریک تھے اور پاکستان بن جانے کے بعد جتنی خوشی دوسرے مسلمانوں کو ہوئی ہوگی اگر اس سے زیادہ ہم کو ہوئی ہو تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔ مگر توبہ کیجیے وہ تو غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ کیا دھرا ہمارا ہے۔ جان کو آگئے ہیں زندگی عذاب کر رکھی ہے اور اب یہ قطعی طے ہے کہ ہم دونوں بیک وقت اس دنیا میں رہ ہی نہیں سکتے یا مولوی نور اللہ زندہ رہیں گے یا ہم۔ خواہ اس سلسلہ میں بزدلی خودکشی کی ترغیب دے یا ہمت قتل کی ترکیب سمجھائے۔

بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ گھر سے نکلے اور مولانا نے آدبوچا۔ ”حضرت میں نے کہا السلام علیکم، ملاحظہ فرمایا آپ نے اپنا پاکستان۔“

اور ہم نے گھوم پھر کر دیکھا تو صرف ایک راہ گیر نظر آیا جو نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی بائی سائیکل پر سوار چلا جا رہا تھا۔ اب ہم حیران کہ یا اللہ اس راہ چلنے والے کی کون سی بات مولانا کو ایسی ناگوار گزری ہے کہ ہم کو پاکستان کے طعنے دیئے جا رہے ہیں۔ ابھی ہم سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ مولانا بالکل قریب آ کر بولے:

”نام رکھا ہے پاکستان دعویٰ یہ تھا کہ صاحب ہم کو ایک خطہ زمین چاہیے جہاں ہم اپنی

روایات کو زندہ کر سکیں۔ ہم کو ایک ایسی مملکت چاہیے جہاں ہم مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں اور دنیا کو اسلامی جہاں بانی سے ایک مرتبہ پھر روشناس کرا سکیں اور حال یہ ہے کہ اب تک ڈاکٹر پوجے جا رہے ہیں، انگریزی دواؤں کے بغیر گویا زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ جب تک انگریزی میں لکھا ہوا نسخہ نہ ہو اس وقت تک جیسے موت ٹل ہی نہیں سکتی۔"

حیرت سے پوچھا:

"کیسا ڈاکٹر مولانا کس کی دوا، کہاں کے نسخے؟"

ان ہی تیوروں سے بولے:

"شیخ صاحب بیمار ہیں نا، اسلامی اخلاق ہے کہ عیادت کرنا چاہیے پڑوسی کی، میں بھی چلا گیا دیکھنے تو دیکھتا کیا ہوں کہ میز پر وہی انگریزی دواخانے سے آیا ہوا مکسچر رکھا ہوا ہے اور منہ میں وہی حرارت دیکھنے کا انگریزی آلہ لیے پڑے ہیں۔ میاں میں پوچھتا ہوں کیا دنیا جہان سے حکیم اڑ گئے ہیں۔ کیا یونانی طب دنیا سے ناپید ہو چکی ہے اور کیا پاکستان بن جانے کے بعد یہ شرف کی بات نہیں ہے کہ یہاں اب بھی ڈاکٹروں کو عروج حاصل ہو اور حکیموں کو پاکستان میں بھی پوچھا نہ جائے اپنا اسلامی طریقہ علاج چھوڑ کر ہم آزاد ہونے کے بعد بھی انگریزوں ہی کی غلامی کر رہے ہیں۔"

دبی زبان سے عرض کیا:

"اچھا گویا آپ نے ہندو پانی اور مسلمان پانی کی طرح طب کے بھی مذہب مقرر کر دیے ہیں۔ اسلامی طب اور انگریزی طب۔"

آنکھیں نکال کر بولے:

"میاں ان ہی باتوں سے آگ لگتی ہے تن بدن میں۔ مذہب میں

نے مقرر کیے ہیں یا اصل میں ہے یہی قصہ، یہ ڈاکٹری انگریزی نہیں
تو کیا اسلامی طریقہ علاج ہے۔''

بہت ادب سے عرض کیا:

''ڈاکٹر یہی نسخے اردو میں لکھنے لگیں گے تو۔''

''لیجیے ان کو ایک نیا مبحث مل گیا، اب منہ نہ کھلواؤ میرا۔ بڑے دعوؤں سے پاکستان بنایا تھا معلوم ہوتا تھا کہ کایا ہی پلٹ جائے گی اور دن پھر جائیں گے مسلمانوں کے بھی، مگر میں تو اب تک یہی دیکھ رہا ہوں کہ وہی ایم-اے، بی-اے کی تیغ یہاں بھی لگی ہوئی ہے اردو کا یہاں بھی وہی حال ہے جو پہلے تھا۔''

اس غلط بیانی کی تردید کیوں نہ کرتے۔ عرض کیا:

''مولانا یہ تو آپ کی زیادتی ہے اردو کو یہاں کی قومی اور سرکاری زبان تسلیم کیا جا چکا ہے اور اگر خدانخواستہ پاکستان نہ بنتا تو اردو غریب کو پنپنے کے لیے یہ گوشہ بھی نہ ملتا اور وہی حال ہوتا جو آج ہندوستان میں اردو کا ہے۔''

دانت پیس کر بولے:

''پھر وہی جان بوجھ کر آنکھوں میں دھول جھونکتے ہو۔ سرکاری اور قومی زبان تو بنا دیا گیا ہے اردو کو پھر کیوں دفتری کارروائیاں انگریزی میں ہوتی ہیں۔ پھر کیوں سرکاری ملازمتوں کے لیے اردو کی قابلیت نہیں دیکھی جاتی بلکہ انگریزی ڈگریاں دیکھی جاتی ہیں۔ ڈاک کے ٹکٹوں پر تو انگریزی کے ساتھ اردو میں پاکستان لکھ دیا گیا ہے مگر ان ٹکٹوں پر جو مہر لگتی ہے وہ کس رسم الخط میں ہوتی ہے۔ ہوائی ڈاک کا لیبل کس زبان میں ہے۔''

عرض کیا:

''مولانا آپ تو نہایت جزوی باتیں کر رہے ہیں اور لطیفہ یہ ہے کہ خود ہی لیبل کہہ گئے۔

کچھ ہکلا کر بولے:

"وہ میں اس لیے کہہ گیا کہ میرے نزدیک تو کوئی تبدیلی پیدا ہی نہیں ہوئی ہے۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ خدا لگتی کہیے گا کہ کیا یہ انگریزیت نہیں ہے کہ اعلیٰ حضرت شہنشاہِ ایران تشریف لائے تو ان کو بھی ڈاکٹر آف لا کی اعزازی ڈگری دی گئی ہے۔"

عرض کیا:

"اور نہیں تو کیا آپ کی رائے میں کوئی منشی فاضل وغیرہ کی اعزازی سند پیش کی جاتی۔"

کہنے لگے: "برادر مکرم آپ تو مضحکہ خیزی پر اتر آئے مگر یقین جانیے کہ اگر ایک اسلامی مملکت کی طرف سے ان کی خدمت میں علوم اسلامی کی دستار فضیلت پیش کی جاتی تو ہم بھی کہتے کہ ہاں صاحب یہ بات ہوئی ہے پاکستان کے شایانِ شان۔ مگر بجائے اس کے یہاں بھی وہی ہوا جو انگلستان میں ہو سکتا تھا۔ صاحب ان کی تشریف آوری کے سلسلہ کے کون سی تقریب ایسی تھی جس میں انگریزیت نہ ہو، عصرانہ کو گارڈن پارٹی کہا گیا اور انگریزی میں اس کے دعوت نامے چھپ کر تقسیم ہوئے۔ عشائیہ کو ڈنر کہا گیا اور کیوں نہ کہا جاتا جب کہ میز کرسی پر خالص انگریزی طریقے سے بیروں نے کھانا کھلایا۔ انگریزی لباس میں لوگ شریک طعام ہوئے اور اپنی ایک ایک ادا سے اس بات کا یقین دلایا کہ انگریز تو چلا گیا ہے مگر اس کا بھوت ابھی تک موجود ہے۔"

مولانا سے بحث کرنا تو بے کار تھا۔ ٹھنڈے دل سے عرض کیا:

"گویا اعتراض صرف یہ ہے کہ فرشی دستر خوان پر کھانا کیوں نہ چنا گیا اور اس کو بجائے ڈنر کے ماحضر کیوں نہ کہا گیا۔"

اور مولانا کو زیادہ خوش کرنے کے لیے عرض کیا:

"ایک بات تو خود مجھ کو بھی کھٹکی تھی کہ فوجی پریڈ میں آخر سیلوٹ کا اب کیا تک ہے جب کہ ہمارے یہاں السلام علیکم یا آداب عرض اور تسلیمات وغیرہ موجود ہیں۔"

مولانا غالباً اس پہلو کو بھولے ہوئے تھے ایک دم ابل پڑے:

"جی ہاں، اور صرف سیلوٹ ہی نہیں بلکہ پوری قواعد انگریزی میں ہوئی حالاں کہ اگر

اپنا خیال تھا تو اردو میں ہوتی یا اگر مہمان کا خیال تھا تو فارسی میں سہی وہ بھی آخر ہماری ہی زبان ہے مگر اردو یا فارسی میں ہوتی تو کیوں ہوتی جب کہ تماشائیوں میں سو فی صدی انگریزی لباس پہننے والے موجود تھے۔ کیوں صاحب یہ ہمارا اور آپ کا بلکہ حکومت کا فرض نہیں ہے کہ اب جب کہ انگریز جا چکا اور ہم آزاد ہیں اپنی آزاد مملکت ہے قانوناً انگریزی لباس کو ممنوع قرار دیا جائے اور عبرت انگیز سزائیں دی جائیں ان سوٹ پہننے والوں کو اور ٹائی کالر باندھنے والوں کو۔“

عرض کیا:

”یا کم سے کم یہ کیا جائے کہ صافہ کرتا اور تہہ بند استعمال کرنے والوں کو سرکاری وظائف ہی ملنے لگیں تاکہ لوگ سمجھ سکیں کہ حکومت کی خوشنودی اسی لباس سے حاصل کی جا سکتی ہے۔“

بڑی چاپلوسی سے بولے:

”اجی توبہ کیجیے وظائف تو درکنار حال تو یہ ہے کہ ایک سوٹ پہننے والا بھی جہاں چاہتا ہے دندناتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور اس قسم کا سادہ لباس پہننے والا خواہ وہ کوئی بھی ہو اپنا بھرم مشکل ہی سے قائم رکھ سکتا ہے۔ پولس والا جب ٹوکے گا اسے مرد مسلمان کہے گا۔“

عرض کیا:

”ہر چند کہ خود میرے داڑھی نہیں ہے مگر میں اکثر غور کیا کرتا ہوں کہ آخر اہلِ پاکستان سے داڑھی کیوں نہیں رکھوائی جاتی؟“

مولانا کو ایک بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ریش مبارک پر ہاتھ پھیر کر بولے:

”اب دیکھ لیجیے کہ ہمارا نیا بجٹ آیا ہے۔ بہت عمدہ بجٹ ہے، میزانیہ۔ معاف کیجیے گا میں نے بجٹ اس لیے کہا تھا کہ شاید میزانیہ نہ سمجھیں۔ تو میں عرض کر رہا تھا کہ نہایت لاجواب ہے یہ میزانیہ البتہ اس میں داڑھی مونڈنے والوں پر ایک ٹیکس جزیہ ہی کہنا چاہیے اس ٹیکس کو بہر حال داڑھی مونڈنے والوں پر ایک جزیہ عائد کر دیا جاتا اور یہ داڑھی مونڈنے کے استروں

کے نرخ بڑھا دیے جاتے اور حجاموں پر پابندی عائد کر دی جاتی تو یقیناً یہ اندازہ ہوتا کہ حکومت کا منشا کیا ہے۔ جناب والا اگر داڑھی مونڈنے پر جزیہ عائد کر دیا جائے اور مونچھیں مونڈنا خلاف قانون کر دیا جائے، انگریزی وضع کے بغیر طبی سند کے کوئی نہ رکھ سکے اور یہ انگریزی سامانِ آرائش ممنوع قرار دیا جائے تو نقشہ ہی بدل جائے پاکستان کا۔"

عرض کیا:

"بے شک اگر اہلِ پاکستان کا حلیہ بدل جائے تو نقشہ بدلنے میں کیا دیر لگے گی۔"

مولانا نے اپنی تائید پا کر انداز گل افشانیٔ گفتار کے اور بھی جوہر دکھائے کہنے لگے:

"بھئی اگر سچ پوچھیے تو میں یہ سمجھتا تھا کہ پاکستان ایک ایسی سرزمین ہوگی جہاں ہر طرف نور ہی نور ہوگا اس مغربی ظلمات کا کوسوں پتہ نہ ہوگا۔ کس قدر طبیعت خوش ہوتی اگر چودھری ظفر اللہ خان صاحب لیک سکس میں بھی اردو میں ہی تقریر کرتے۔"

عرض کیا: "جی اور کیا دنیا کو غرض ہوتی تو خود ترجمے کراتی پھرتی۔"

کہنے لگے:

"بھائی میرے اردو زبان اس وقت تک عالم گیر حیثیت حاصل ہی نہیں کر سکتی ہے جب تک کہ عالم گیر معاملات میں اس کو استعمال نہ کیا جائے۔ صاحب آگ ہی تو لگ جاتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے پاکستان میں بھی جس کو دیکھیے وہ انگریزی ہی اخبار پڑھتا ہے گویا انگریزی اخباروں کی خبریں زیادہ سچی ہوتی ہیں اور اردو اخبار گویا کسی قابل ہی نہیں ہیں۔ اب ایمان سے کہیے کہ کیا اس کی ضرورت نہ تھی کہ ان انگریزی اخباروں کا ایک سرے سے مقاطعہ کر دیا جاتا کہ جاؤ تمہارے پڑھنے والے تشریف لے گئے:

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

کہ میں تو جو زور و شور انگریزی اخبار کا دیکھ رہا ہوں وہ اردو اخباروں کا کم از کم مجھ کو نظر نہیں آتا۔"

مولانا کو ایک گوشہ سمجھاتے ہوئے عرض کیا:

"بات یہ ہے قبلہ کہ خبر رساں ایجنسیاں اب تک انگریزی ہی میں تار بھیجتی ہیں۔"

مولانا جلبلا گئے:

”وہ بھیجتی اس لیے ہیں کہ ان پر کوئی قانونی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے۔ ذرا سرکاری طور پر ان کو منع کر کے دیکھا جائے طبیعت ٹھکانے آ جائے گی اور آنے لگیں گے اردو میں تار وار سب مگر آپ کے پاکستان والوں کو اس کا خیال ہی کب ہے اور پروا ہی کس کو ہے۔“

اب ہم نے بھی احتجاج کیا:

”مولانا یہ آپ میرا پاکستان کیوں بنائے ہوئے ہیں حالاں کہ خود آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان جس قدر آپ کا ہے اس سے زیادہ میرا نہیں مگر طعنہ آپ مجھ کو دیتے ہیں۔“

کہنے لگے:

”جی طعنہ یوں دیتا ہوں کہ دیکھ رہا ہوں آپ کی وضع قطع آپ کی طرز معاشرت اور آپ کے رہنے سہنے کے طور طریقے یہ جو آپ نے اپنی روزانہ نشست کا اسم مبارک ڈرائنگ روم رکھ چھوڑا ہے اس میں بجائے مسند اور تکیہ کے صوفہ سیٹ سجا رکھے ہیں اور دیواروں پر تصاویر آویزاں ہیں عجیب عجیب قسم کی۔ اور یہ جو آپ کا کھانے کا کمرہ ہے جسے آپ ڈائننگ روم کہتے ہیں میز کرسیوں سے آراستہ ہے یہ سب انگریزیت نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ پاکستان کی مناسبت سے اپنے ان کمروں کو بھی مشرف بہ اسلام کرتے تو معلوم ہوتا کہ یہ ایک پاکستانی کا گھر ہے۔ صاحب اس قسم کے گھر تو آپ کو انگلستان میں بھی مل جائیں گے ان میں پاکستانی خصوصیت کیا ہے، اور یہ جو آپ کوٹ پتلون زیب تن کیے ہوئے ہیں کیا یہ آپ کا قومی لباس ہے۔“

”اف بھئی میں نے تو کسی انگریز کو کبھی نہیں دیکھا کہ اس نے آپ کے ملک میں آ کر شیروانی پہنی ہو، پاجامہ زیب تن کیا ہو اور آپ ہیں کہ اپنے ہی ملک میں بیٹھے دوسروں کے لباس تک اپنائے لیتے ہیں۔ خیر پہلے تو آپ غلام تھے مگر اب تو آزاد ہیں اب تو آپ کو چاہیے کہ اپنا قومی لباس اختیار کریں تاکہ جس طرح اب تک آپ نے دوسروں کے سوٹ پہنے ہیں اسی طرح دوسرے آپ کا لباس فخر کے ساتھ استعمال کریں۔“

عرض کیا: "مولانا یہ بات آپ نے کچھ واقعی معقول نما کہی ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ ابھی تک ہمارا قومی لباس طے نہیں ہوا ہے۔"

مولانا بولے: "تو آخر کب طے ہوگا جب یہ سوٹ آپ کی کھال بن کر رہ جائے گا آخر اب تک قومی لباس تک طے کرنے کا ہوش نہیں آیا۔"

عرض کیا: "مولانا قصہ دراصل یہ ہے کہ ابھی اہم کاموں کا انبار ختم نہیں ہوا ہے کہ ان جزویات کی طرف توجہ دی جا سکے۔ ابھی تو اپنے کو منظم اور مستحکم کرنے کے نہایت اہم مسائل میں الجھے ہوئے ہیں سب کے سب بہرحال جب تک ہم اور آپ ہی یہ طے کرلیں کہ قومی لباس کیا مناسب رہے گا۔"

کہنے لگے: "بس دیکھ لو مجھ کو نہایت شریفانہ لباس پہنے کھڑا ہوں۔"

ہم نے سر سے پیر تک مولانا کا جائزہ لے کر عرض کیا:

"ممکن ہے کہ یہ شریفانہ لباس ہو مگر ہم کو ان میں سے کچھ چیزیں غیر شریف طبقہ کے لیے بھی تو چھوڑنا پڑیں گی آخر وہ بے چارے کیا پہنیں گے۔"

کہنے لگے: "دیکھیے صاحب یہ رہا صافہ نہایت متین چیز بھی ہے اور بھاری بھرکم بھی جتنا چاہیے اس کو خوش نما بنا لیجیے پھر یہ کہ خالص اسلامی چیز ہے۔"

عرض کیا: "دیکھیے قبلہ اختلاف یہیں سے شروع ہو جائے گا اس لیے کہ قومی لباس میں اگر اب تک کوئی چیز طے ہو سکی ہے تو وہ صرف سر کی پوشش ہے اور شاید آپ بھول رہے ہیں کہ جناح ٹوپی کو قومی لباس کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔"

مولانا نے بھی عید کے دن جناح ٹوپی پہنی تھی جو خود توانی کوزی معلوم ہی ہوتی تھی مگر مولانا اس حد تک کیتلی نظر آتے تھے کہ گویا ذرا سر جھکایا اور ناک سے بھاپ نکلتا ہوا چائے کا پانی نکلنے لگے گا۔ غالباً خود مولانا کو بھی اپنا وہ حلیہ یاد آگیا ہوگا کہنے لگے:

"جناح ٹوپی ہے تو ٹھیک مگر صافہ بھی ترک نہ کرنا چاہیے۔ بہرحال چلیے جناح ٹوپی بھی اس کے بعد لمبا کرتا اور کرتے پر جاڑے میں صدری اور گرمیوں میں کچھ نہیں۔"

عرض کیا: ”غضب کر رہے ہیں مولانا آپ، یہ لباس آپ پہنیں گے تو کانگریسی نیتا کیا کریں گے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ صدری کہتے ہیں وہ نہرو جیکٹ کہتے ہیں۔ لمبا کرتا ان کا بھی ہوتا ہے۔“

بات کاٹ کر بولے: ”بھئی اس لباس پر چغہ پہن لیا جائے۔“

مولانا شاید لباس کی اور تفصیل بتاتے کہ ان کے صاحب زادے نوکر کے سر پر کموڈ اٹھوائے ہوئے جاتے نظر آئے تو مولانا نے پکارا ”اللہ کے بندے یہ کہاں لے جا رہے ہو؟“

جواب ملا: ”چھڑ جڑوانے جا رہا ہوں صبح ٹوٹ گیا تھا۔“

اور ہم نے مولانا سے پوچھا قبلہ: ”یہ کموڈ اور آپ کے یہاں۔“

کہنے لگے: ”ارے بھئی یہ کوئی میرا تھوڑی ہے جب مکان پر قبضہ کیا ہے تو یہ چیزیں مکان ہی میں نکلی تھیں۔ لہٰذا اب مجبوراً ان کو استعمال کرنا ہی پڑا ہے اور جب ان چیزوں کو استعمال کرتا ہوں ضمیر بھی ملامت کرتا ہے کہ بھلا یہ بھی کوئی پاکستان ہے مگر میں تو کچھ یہی حال ہر طرف دیکھ رہا ہوں اور دیکھ دیکھ کر جل رہا ہوں۔“

* * *

کچھ یادیں کچھ باتیں

میری ادبی زندگی کا آغاز عجیب ہنگامہ سے ہوا ہے بلکہ میں تو اس کو ایک ہنگامہ سے زیادہ شامت ہی کہوں گا۔ جس طرح شامت بغیر کسی اطلاع کے آجایا کرتی ہے اسی طرح مجھ پر یہ سانحہ گزرا کہ میں بیٹھے بٹھائے شاعر بن گیا حالاں کہ مجھ کو اچھی طرح معلوم تھا والد محترم میرا نالائق نکل جانا اور میرا شاعر بن جانا یکساں قسم کی بات سمجھیں گے اس لیے کہ میں ایک چچازاد بھائی کے متعلق ان کی اس رائے سے پوری طرح آگاہ تھا جو ان کے شاعر نکل جانے کے بعد والد محترم نے قائم کر رکھی تھی مگر ان بھائی جان کی شاعرانہ عظمت کا میں کچھ ایسا قائل تھا کہ خود اپنے کو بھی شاعر بنائے بغیر نہ رہ سکا۔ شروع شروع میں تو شاعری کی کچھ ''پرائیویٹ پریکٹس'' کرتا رہا۔ جس میں چوری اور سینہ زوری دونوں کو دخل تھا کہ انہیں بھائی جان کا کلام نقل کر کے اپنے دوستوں میں لے جاتا تھا اور ان کے تخلص کی جگہ اپنا تخلص فٹ کر کے اپنے دوستوں کو وہ کلام لہک لہک کر سناتا تھا۔

اس سے قبل کہ میں کچھ عرض کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے تخلص والی بات نہ رہ جائے کہ میں نے شوکت تخلص کیوں رکھا۔ بات یہ کہ جس زمانہ میں میں شاعر بن رہا تھا۔ علی برادران اور مہاتما گاندھی کا بڑا نام تھا۔ اب یا تو میں اپنا تخلص گاندھی رکھ سکتا تھا ورنہ علی برادران میں سے کسی کا نام اپنے تخلص کے لیے منتخب کر سکتا تھا، مولانا محمد علی کے نام کے دونوں اجزا مجھے تخلص کے لیے مناسب نہیں معلوم ہوئے، البتہ مولانا شوکت علی میرے دل میں اتر گیا۔ پھر اس تخلص کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ بھائی جان کا تخلص ارشد ہٹا کر اس شوکت کو آسانی سے فٹ کیا جا سکتا تھا لہٰذا میں نے اس اعتبار سے بھی اس تخلص کو اپنے لیے مناسب سمجھا اور بھائی جان کے مقطعوں میں اس کو رکھ کر اپنے دوستوں کو سناتا رہا۔ مگر ایک دن ناگاہ ایک غزل مجھ سے

سرزد ہوگئی اور کچھ نہ پوچھیے میری خوشی کا عالم جب میں نے اپنی ذاتی غزل مکمل کر کے احباب سے داد حاصل کی۔ مگر چوں کہ یہ چوری کی غزل نہ تھی لہٰذا بے ساختہ دل چاہنے لگا کہ غزل میرے نام سے کہیں نہ کہیں چھپ ضرور جائے۔ میں نے اس غزل کی کئی نقلیں کیں اور اپنے گھر آنے والے تمام ادبی رسالوں کے پتہ پر ایک ایک نقل اس اپیل کے ساتھ روانہ کر دی کہ:

بہر خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجیے

جس شامت کا میں نے ذکر کیا ہے وہ یوں آئی کہ ایک دن ڈاک میں مجھ کو اپنے نام آیا ہوا ایک رسالہ ملا۔ میرے نام رسالہ کا آنا ہی مرے لیے کیا کم اہم تھا کہ اب جو اس کو کھول کر دیکھتا ہوں تو اس میں میری وہی غزل ''رنگِ تغزل'' کے زیرِ عنوان چھپی ہوئی تھی اور عنوان کے نیچے میرا انام بھی نہایت نمایاں حروف میں درج تھا۔ ''نتیجۂ فکر شیخ محمد عمر حیات شوکت تھانوی'' کاش آپ کو یقین آجائے کہ مجھ کو اپنی نگاہوں پر اعتبار نہ آسکا۔ بار بار آنکھوں کو ملتا اور شروع سے آخر تک اس غزل کو پڑھتا تھا۔ ہر چند کہ کسی طرح سیری نہ ہوتی تھی مگر اب جی چاہنے لگا تھا کہ گھر کے دوسرے افراد بھی اس غزل کو دیکھیں اور اندازہ کریں کہ ان میں ایک ایسا جوہر قابل موجود ہے جو ایک ستارہ بن کر طلوع ہوا جس کو آفتاب بن کر نصف النہار پر پہنچنا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک چھوٹی سی میز ایک ایسے کمرے کے وسط میں رکھ دی جس میں سے سبھی کا گزر ہوتا رہتا تھا اور اس میز پر اس رسالے کا وہی غزل والا صفحہ کھول کر رکھ دیا کہ اس کی زیارت سے ہر اہلِ بصیرت مشرف ہو سکے۔

سب سے پہلے نظر جس اہلِ بصیرت کی اس رسالہ پر پڑی وہ والد صاحب قبلہ ہی تھے۔ پہلے تو یوں ہی سرسری نظر سے اس رسالہ کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے مگر پھر ٹھٹکے۔ واپس لوٹے، رسالہ کو اٹھایا اور چشمہ لگا کو پوری توجہ سے اس کو دیکھتے رہے غالباً انہوں نے ایک مرتبہ پڑھنا کافی نہ سمجھ کر اس لیے دیر تک پہلے تو اسی صفحہ کو دیکھتے رہے کہ اس کے بعد رسالہ کے باقی صفحات پر بھی جستہ جستہ نظر ڈالی اور آخر اس رسالہ کو لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے جہاں سے والدہ محترمہ کو آواز دی:

"میں نے کہا کہاں ہیں آپ ذرا تشریف لائیے۔"

اس قسم کی آواز وہ عموماً اس موقع پر دیا کرتے تھے جب ان کو والدہ محترمہ سے کسی کی شکایت کرنا ہوتی تھی۔ ورنہ عام حالات میں تشریف لانے کا ذکر نہ ہوتا تھا۔ صرف اتنا ہی کافی ہوتا تھا کہ "ارے بھئی! میں نے کہا سنتی ہو" لہٰذا ایک نوا شناس کی حیثیت سے والدہ محترمہ فوراً سمجھ گئیں کہ کسی نے کوئی گل کھلایا ہے اور اس کی جواب دہی اب ان کو کرنا پڑے گی۔ وہ اس جواب دہی کے لیے تیار ہوتی ہوئی ان کے کمرے میں پہنچیں تو والد صاحب نے ان کو دیکھتے ہی کہا:

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے
تیرے کوچہ میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

میں پوچھتا ہوں کہ یہ اس نامعقول کوچہ میں جاتے ہی کیوں ہیں۔

والدہ بے چاری نے نہایت معصومیت سے فرمایا:

"مجھے تو خبر نہیں کہاں جاتا ہے اور کیوں جاتا ہے۔"

والد صاحب نے فرمایا: اور سنیں فرماتے ہیں آپ کے فرزند ارجمند کہ:

انہیں جانبر کبھی ہوتے ہوئے دیکھا نہیں شوکتؔ
جو عاشق مرضِ مہلک کے کبھی بیمار ہوتے ہیں

مرض بھی ہوا تو وہ جس کی کمزوری کی وجہ سے مرض کی "ر" تک متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے۔ مرض کی "ر" کو ساکن سمجھنے والا اگر شاعر ہو سکتا ہے تو تف ہے اس شاعری پر اور جس رسالہ نے اس خرافات کو شائع کیا ہے۔ اس کو تو میں کیا کہوں۔ ذرا اس رسالہ کا اسم مبارک ملاحظہ ہو "ترچھی نظر" لاحول ولا قوۃ۔ اب یہ ادبی رسالوں کے نام ہونے لگے ہیں۔ ترچھی نظر، بانکے سانوریا، رنگیلے بالم، کچھ پلے بھی پڑا کہ واقعہ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بلند اقبال چشم بدور شاعر ہو گئے ہیں۔ شوکت تخلص فرماتے ہیں اور اس بکواس کو غزل کہتے ہیں۔ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل۔ نہ صاحب زادے کا املا درست ہے نہ انشا اور چلے ہیں شاعری کرنے۔ اب نہ

لکھنے کے رہیں گے نہ پڑھنے کے صرف شاعری کریں گے اور ترچھی نظر میں اپنا کلام چھپواتے رہیں گے۔ ان سے کہہ دیجیے کہ آئندہ میں نہ سنوں کہ یہ شاعر ہیں اور آیندہ میں نہ دیکھوں ان کی غزل کسی ”ترچھی نظر یا پتلی کمر میں“۔

لیجیے صاحب شاعری ختم، تخلص ضبط اور ہم رہ گئے برخوردار محمد عمر سلمہٗ قسم کے ایک خالص طالب علم مگر مثل مشہور ہے کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ رسالہ ”ترچھی نظر“ لاکھ ترچھی نظر سہی مگر اس نے ہماری پہلی غزل چھاپ کر وہ احسان کیا تھا کہ اس کے ایڈیٹر کا شکریہ ادا نہ کرنا ایک عجیب بداخلاقی سا محسوس ہونے لگا۔ آخر ایک دن میں اس دفتر میں جا پہنچا اور اس کے ایڈیٹر امین سلونوی صاحب سے تعارف حاصل کر لیا۔ امین سلونوی صاحب تو واقعی بانکے سنوریا نکلے مونچھوں کی جگہ لبوں میں دو ابابیلیں دبائے کسی ترک جرنیل کی طرح اپنے دفتر میں بیٹھے ملے۔ مونچھیں دیکھ کر تو ڈر معلوم ہوتا تھا مگر ان مونچھوں کے نیچے سے وہ آدمی بہت ملنسار نکلے اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ پیش آئے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد شکایت کی ایک غزل کے بعد پھر آپ نے ”ترچھی نظر“ کو بھلا ہی دیا۔ عرض کیا جی ہاں، وہی اکلوتی غزل تھی جو یہ ہمارے لیے بھاگوان ثابت ہو سکی اور غزل کے سلسلہ کی تمام بپتا کہہ سنائی۔ بپتا غالباً اسی مصیبت کو کہتے ہیں جو باپ کی طرف سے نازل کی جائے۔ اس بپتا میں زیادہ زور اس بات پر دیا کہ آپ کے رسالہ کا نام ترچھی نظر ہمارے حق میں بے حد قاتل ثابت ہوا اس لیے والد محترم کو اس ترچھی نظر پر خصوصیت سے اعتراض تھا۔ امین سلونوی صاحب نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی کہ دراصل یہ نام محض ”ترچھی نظر“ نہیں ہے بلکہ ”ترچھی نظر بلدہ لکھنؤ“ اور اس سے تاریخ نکلتی ہے، عرض کیا ایسی بھی کیا تاریخ نکالنا کہ خود آپ نے ہماری ہی تاریخ وفات نکلوا کر رکھ دی۔ امین سلونوی صاحب نے بتایا کہ وہ خود اس نام کو تبدیل کرنے والے ہیں اور اس کا نام اب صرف ”نظر“ رکھنے والے ہیں۔ عرض کیا کہ آپ نے اس کا یہ شریفانہ نام رکھ دیا تو اس میں کچھ نہ کچھ لکھنے کے باوجود شاید ہم بھی والد محترم کے ”نورِ نظر“ رہ سکیں۔

حسب وعدہ امین سلونوی صاحب نے ”ترچھی نظر“ کا اگلا نمبر ”نظر“ ہی کے نام سے

شائع کیا اور والد صاحب نے اس کو صرف ''نظر'' دیکھا تو یہ فرمایا کہ ''الحمد للہ'' اس کا ترچھا پن تو دور ہوا۔'' مگر باوجود اس الحمد للہ کے میں نے پھر کوئی غزل اس میں یا کسی اور رسالہ میں نہ چھپوائی البتہ امین سلونوی صاحب کے بے حد اصرار پر ایک مضمون ''میٹھے چاول'' کے نام سے لکھا۔ یہ میری پہلی نثری کاوش تھی اور یہ میرا پہلا مضمون ہی مزاحیہ تھا۔ جب یہ مضمون رسالہ ''نظر'' میں چھپ کر آیا تو اس غزل ہی والے تیوروں کے ساتھ والد محترم نے اس کو پڑھا مگر اس مرتبہ والدہ محترمہ کی پیشی نہیں ہوئی اور نہ اس مضمون میں کسی متحرک کو ساکن کہہ کر لاحول بھیجا گیا بلکہ ایک عجیب وغریب منظر ایک دن یہ دکھائی دیا کہ والد صاحب وہی مضمون اپنے ایک دوست کو بیٹھے سنا رہے تھے اور وہ دوست یہ تبصرہ کر رہے تھے کہ ان برخوردار کے اس شوق کو ختم نہ ہونے دیجیے۔ شاعری کے متعلق تو مجھ کو پہلے ہی آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ مگر اس مضمون کے پالنے میں اس بچے کے پیر نظر آرہے ہیں۔ والد صاحب کا البتہ کچھ پتہ نہ چل سکا کہ ان کی رائے کیا تھی مگر اپنے دوست کو یہ مضمون سنانے سے اندازہ تو یہ ہوا کہ وہ غالباً خوش ہوئے ہیں۔ لہٰذا نثری مضامین تو جاری رہے البتہ شاعری کی پھر ہمت نہ ہو سکی اور جب امین سلونوی صاحب نے بہت ہی ناک میں دم کر دیا تو ان سے صاف صاف کہہ دینا پڑا کہ اول تو مجھے عاق ہونا نہیں ہے دوسرے شعر کہنے کے لیے جس سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے اس سے میں بے بہرہ ہوں۔ اللہ جانے پھر کس متحرک حرف کو ساکن باندھ کر خود بندھ جاؤں اور بندھا ہوا مار کھاؤں۔

امین سلونوی صاحب خود بھی ذرا میرے ہی جیسے شاعر تھے مگر ان کو مولانا عبدالباری آسی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا لہٰذا ان کا کلام مولانا آسی کی نظر سے گزرنے کے بعد جملہ اسقام سے پاک ہو کر سامنے آتا تھا وہ اکثر مولانا آسی کے اشعار سنایا کرتے تھے اور ان کے تجربے کے چرچے کیا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مولانا کا ایک شعر سنایا:

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئین وفا بدلا

یہ شعر میرے دل کو ایسا لگا کہ میں متواتر کئی دن تک اس شعر کو گنگناتا اور وجد کرتا رہا۔

آخر شعر کی کیفیت میں ڈوبنے کے بعد جب میں ابھرا تو امین سلوتوی صاحب سے استدعا کی کہ میں بھی اگر شعر گوئی میں کسی کی رہنمائی قبول کر سکتا ہوں تو وہ یہی شخص ہے جس نے یہ شعر کہا ہے ۔ چنان چہ امین صاحب کی معیت میں اسی دن میں مولانا سے نیاز حاصل کرنے ایک نہایت بوسیدہ مکان کے دروازے پر موجود تھا۔ امین صاحب کی آواز کے جواب میں آواز آئی کہ تشریف لے آیئے اور میں امین صاحب کے پیچھے پیچھے ایک ایسے مکان میں داخل ہوا جو مکان کم اور چڑیا خانہ زیادہ معلوم ہوتا تھا، بے شمار کبوتر اس مکان کے صحن میں غٹرغوں کرتے پھر رہے تھے اور اس کے غول میں چند مرغیاں بھی کٹکناتی پھر رہی تھیں ۔ ایک طرف طوطے کا ایک پنجرہ لٹکا ہوا تھا اور عین اس وقت جب کہ اس جانور کو دیکھ رہا تھا نہایت پھرتیلا خرگوش ایک بلی کے مراقبہ میں مخل ہوتا ہوا ایک تخت کے نیچے گھستا نظر آ چکا تھا۔ اسی تخت پر دو صاحبان بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے اور میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ خدا کرے کہ دونوں میں سے کوئی مولانا آسی نہ ہوں اس لیے کہ ایک صاحب تو اس قدر زائد المیعاد بزرگ تھے کہ غالباً ملک الموت کی بھول چوک میں پڑے ہوئے تھے اور دوسرے صاحب نہایت میلے پاجامہ پر نہایت صاف شفاف قمیض پہنے معلوم نہیں اپنے حریف کو مارنے کی فکر میں تھے یا اس کے کسی مہرے کے لیے پینترا بدل رہے تھے۔ جب میں الجھا دینے والا کھیل دیکھ کر یہاں سے بھاگ نکلنے کے لیے راہِ فرار تجویز کرنے لگا تو میلے پاجامہ اور صاف قمیض والے محترم نے بڑے فخر سے جھومتے ہوئے کہا۔ چال واپس نہ ہو گی یہ شہ اور یہ مات، خدا خدا کر کے وہ بازی ختم ہوئی تو امین صاحب نے انہیں میلے پاجامہ اور صاف قمیض والے بزرگ پر یہ تہمت لگائی کہ ’’آپ ہی ہیں علامہ عبدالباری آسی‘‘ اور فوراً ہی میرا تعارف بھی ان سے کرا دیا گیا۔ مولانا بڑے تپاک سے ملے۔ امین صاحب کی درخواست پر تقریباً بادل ناخواستہ اپنی وہی غزل ارشاد فرمائی جس کا ایک شعر میں تین دن سے گنگناتا پھر رہا تھا اور اس کے بعد امین سلونوی صاحب ہی نے میری اس خواہش کا اظہار کیا کہ مولانا سے شرف تلمذ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے اس درخواست کو

منظور تو فرما لیا مگر میں اب تک اس شش و پنج میں تھا کہ اگر میری شاعری کی والد محترم کو پھر اطلاع ہوگئی تو کیا ہوگا مگر یہ کہنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ میں بصیغہ راز شاعر بننا چاہتا ہوں اور جب تک والد صاحب اجازت نہ دے دیں انڈر گراؤنڈ رہنا چاہتا ہوں۔

(۲)

مولانا عبدالباری آسی سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے بعد شاعری بڑے زور کے ساتھ جاری ہو چکی تھی مگر شور کے ساتھ جاری کرنے کی ہمت نہ ہوئی کہ مبادا والد محترم کو خبر ہو جائے اور ادھر تو اصلاح سخن ہوتی رہے، ادھر "مرمت سخنور" کی نوبت آجائے۔ مولانا آسی کو بھی یہ بات بتائی جا چکی تھی کہ میں ذرا "کانفی ڈینشیل قسم کا شاعر بننا چاہتا ہوں اور اپنی شاعری کو پردہ نشیں رکھنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا مشاعروں کی شرکت سے معذرت چاہوں گا ویسے مشق سخن جاری رکھوں گا۔ مولانا آسی نہایت سمجھ دار قسم کے بزرگوں میں سے تھے انہوں نے کبھی مجھ کو میری اس مجبوری پر عبور حاصل کرنے کے لیے نہ ابھارا اور مشاعرے میں شرکت پر مجبور نہ کیا البتہ میری غزلوں پر اصلاح بڑے خلوص اور نہایت توجہ سے دیتے رہے اس سے ایک فائدہ مجھ کو یہ بھی پہنچا کہ چوں کہ میں ان کا "مشاعرہ جاتی" شاگرد نہ تھا لہٰذا مجھ کو انہوں نے مجھے آنریری شاعر بنانے کی کبھی کوشش نہ کی ورنہ میں نے ان کے شاگردانِ رشید کے لشکر جرار کی وہ پریڈ بھی نہایت عبرت سے دیکھی ہے جو مشاعرے کے دن ان کے در دولت پر ہوا کرتی تھی کہ یہ تمام شاگرد جمع ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک کاغذ اور ایک پنسل یا قلم ہے۔ کوئی کبوتروں کی ڈھابلی پر بیٹھا ہوا ہے، کسی کو طوطے کے پنجرے کے عین نیچے جگہ ملی ہے۔ کسی کو بیٹھنے کے لیے مرغیوں کا ٹاپا مل گیا ہے۔ کچھ شاگرد تخت پر ٹکے ہوئے ہیں، کچھ چارپائی پر اور ایک آدھ ایسا ہے جو کسی کونے میں "کھڑا کھیل فرق آبادی" کھیل رہا ہے۔

مولانا آنکھیں بند کیے حقے کی نے منہ میں لیے فکر سخن میں محو ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد "آہاہا" کہہ کر جھومتے ہیں آنکھیں کھول کر کہتے ہیں۔ جواد صاحب آپ لکھ لیجیے یہ مطلع اور

ترنم کے ساتھ مطلع پڑھ کر جواد صاحب کو لکھوا دیتے ہیں اس سے کوئی بحث نہیں ہے کہ جواد صاحب نے اس مطلع کا املا بھی درست لکھا ہے یا نہیں۔ مولانا پھر فکر سخن میں ڈوب گئے اور جب کوئی شعر لے کر ابھرے تو پھر پہلے ''آہاہا'' اور اس کے بعد آنکھیں کھول کر جھومتے ہوئے ارشاد کیا کہ ''منور صاحب! یہ شعر آپ لکھ لیجیے'' اسی طرح باری باری وہ سب کو شعر لکھوائے چلے جاتے تھے اور سب شاگردوں کے سادہ کاغذ سیاہ ہوتے جاتے تھے۔ گھنٹوں کی اس بے گار کے بعد کوئی گیارہ شعر کی غزل لے کر رخصت ہو جاتا تھا کوئی سات شعر کی اور کوئی تیرہ شعر کی اور ان سب کے رخصت ہو جانے کے بعد مولانا خود اپنے لیے غزل کہتے تھے جس کا سلسلہ سرِ مشاعرہ بھی جاری رہتا تھا کہ مشاعرہ ہو رہا ہے اور مولانا شعر بھی کہہ رہے ہیں دوسرے شعرا کو داد بھی دیتے جا رہے ہیں بظاہر ان کا کلام بھی سن رہے ہیں مگر دراصل خود اپنی غزل مکمل کر رہے ہیں۔

اس سلسلہ کا ایک لطیفہ میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ مشاعرے میں ایک شاعر نے مصرع پڑھا:

گری ہے برق میرے آشیانے پر

اور مولانا نے اپنے نزدیک یہ مصرع یوں اٹھایا کہ:

ستم ظریفیِ قدرت ہے تہمتوں کے لیے

وہ گویا اس شاعر کے بجائے عالم محویت میں اپنا ہی مصرع پڑھ گئے تھے۔ چنان چہ ان کو ایک آدھ قریب بیٹھے ہوئے شاعر نے گھور کر دیکھا بھی کہ یہ مصرع کہاں سے اٹھا لائے ہیں۔ شاعر پڑھ رہا ہے زمین کی اور یہ سن رہے ہیں آسمان کی۔ میں اکثر مولانا کے ان شاگردوں کے متعلق جو ''آزیری شاعر'' بنے ہوئے تھے غور کیا کرتا تھا کہ جب یہ خود شعر کہتے ہی نہیں ہیں تو آخر ان کو کس حکیم نے نسخہ میں لکھ دیا ہے کہ تخلص پاتے پھرو اور غزل پڑھو ضرور۔ خیر اس کا تو ذکر نہیں خود مولانا آسی کی یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ اتنے مفروضہ شاعروں کو کیوں سمیٹے ہوئے ہیں اور ان کو اپنا بھیجہ کیوں تناول کراتے ہیں مگر دراصل یہ تھی اکھاڑہ بازی کی بات کہ کسی اور استاد سے ہمارے شاگردوں کی تعداد کم نہ رہ جائے ورنہ ہم ذرا کم درجے کے استاد سمجھے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں ایک اور استاد کا لطیفہ بے قرار ہے کہ اس کو ضرور پیش کر دیا جائے ان استاد

کے شاگرد ایک نیا شاگردی کا امیدوار پھانس لائے تو اس استاد نے شاگرد کو مرعوب کرنے کے لیے جہاں اور بہت سی باتیں کہیں وہاں یہ بھی کہہ دیا کہ اس وقت اطراف ملک میں میرے سولہ سو شاگرد ہیں۔ بات آئی گئی ہو گئی مگر جب وہ نیا شاگرد چلا گیا تو اس کو پھانس کر لانے والے شاگرد نے اپنا سر پیٹ لیا کہ "استاد آج تو آپ نے لٹیا ہی ڈبو دی کہ اس سے کہہ دیا کہ میرے سولہ سو شاگرد ہیں حالاں کہ میں سولہ ہزار کہہ کر لایا تھا۔" مختصر یہ کہ یہ استادی شاگردی کا اکھاڑہ بازی کا معاملہ تھا اور ان رموز کو سمجھنے سے میں قاصر تھا مگر چوں کہ میں مولانا کا "مشاعرہ جاتی" شاگرد نہ تھا۔ لہٰذا اس طوفانی ماحول میں اصلاح سخن کے لیے کبھی میں نے حاضری نہ دی اور جب کبھی باریاب ہوا انتہائی پر سکون لمحات میں باریاب ہوا تاکہ وہ توجہ سے میری غزل دیکھیں۔ اس کی غلطیاں اور خامیاں میرے ذہن نشیں کروائیں اور اپنے اصلاحی نکتے مجھ کو سمجھائیں۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ایک دن مولانا آسی نے فرمایا پنڈت جگت موہن لعل رواں نے اناؤ میں ایک مشاعرہ کیا ہے میں چاہتا ہوں آپ بھی چلیں۔ یہ لکھنؤ کا مشاعرہ تو ہے نہیں کہ آپ کو اپنی شاعری کی بے پردگی کا خوف ہو، مولانا نے پہلی مرتبہ یہ بات کہی تھی۔ مشاعرہ بھی لکھنؤ سے یعنی والد محترم سے دور اناؤ میں تھا لہٰذا میں ہمت کر کے تیار ہو گیا۔ طرح غالب کی تھی:

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

میں نے بڑی محنت سے غزل کہی، مولانا آسی نے بھی اس غزل کو خصوصیت کے ساتھ پسند کیا۔ چوں کہ پہلی مرتبہ مشاعرہ پڑھنے کا اتفاق ہو رہا تھا لہٰذا اس کی دھن بھی غسل خانوں میں چھپ چھپ کر بنائی۔ اس زمانے میں آواز بھی آج کل کی سی بھیانک نہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ مشاعرے میں غزل خوب چمکی مگر جب غزل چمکی تو ایک بجلی بھی مجھ پر یہ گری کہ اسی مشاعرے کے ایک شاعر مرزا فخر اللہ بیگ مشاعرے کے بعد میرے پاس آئے، نہایت شفقت سے داد دی بڑی دیر تک گلے لگاتے رہے اور آخر میں یہ کہہ کر میرا دل نکال لیا کہ وہ والد محترم کے نہایت قریبی دوستوں میں سے ہیں لہٰذا مجھ کو مشاعرے میں سرسبز دیکھ کر ان کو بے حد مسرت ہوئی ہے۔ کاش ان کو معلوم ہوتا کہ ان کی یہ مسرت میرے لیے کتنی بڑی مصیبت بن کر رہ گئی

تھی اور یہ سننے کے بعد سے میں کس قدر اختلاج میں مبتلا تھا کہ اگر ان نامراد چچا نے والد محترم سے اس مشاعرے کا ذکر کر دیا تو خدا جانے ہم پر کیا قیامت ٹوٹے گی۔ چنان چہ وہی ہوا کہ واپس جا کر ان کمبخت چچا نے پہلا کام یہی کیا کہ دوسرے ہی دن والد محترم کے پاس تشریف لاتے نظر آئے۔ میں ان سے اور والد صاحب سے اپنے کو چھپا کر گھر میں موجود ہوتے ہوئے بھی مفقود ہو گیا۔ کئی مرتبہ مجھ کو آواز دی گئی مگر میں تو گدھے کے سر کے سینگ بن چکا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ حضرت ٹلے اور میں ایک دوسرے راستہ سے نکل کر گھر کے باہر چلا گیا مگر آخر کہاں تک منہ چراتا دوسرے ہی دن میرا سامنا ہوتے ہی والد محترم نے پہلی بات یہی کہی کہ:

موت برحق تھی مگر کاش نہ آتی شب غم
یہ تو کہنے کو نہ ہوتا کوئی ارماں نکلا

دراصل یہ شعر میں نے یوں کہا تھا:

موت برحق تھی مگر کاش نہ آتی شب غم
یہ تو کہنے کو نہ ہوتا اک ارماں نکلا

مولانا آسی نے اس میں "اک" کے ٹکڑے کو کاٹ کر "کوئی" بنا دیا تھا۔ بہر صورت والد محترم نے اس بار بڑی رواداری کا ثبوت دیا تھا جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اب میری شاعری کو شربت کا گھونٹ بنا کر پینے کو تیار ہو گئے تھے۔ لہٰذا اس نقاب کشائی کے بعد مجھ کو اپنی شاعری چھپانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اتفاق سے ان ہی دنوں کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی کے مالک حاجی محمد مصطفیٰ خان صاحب کے یہاں اسی مصرع پر طرحی مشاعرہ ہوا اور مرزا فخر اللہ بیگ نے والد ہی کے ذریعے مجھ سے اس مشاعرہ میں شرکت کی تاکید کرائی، چنان چہ میں اس مشاعرے میں بھی شریک ہوا اور اس مشاعرے کے تیسرے دن حاجی محمد صاحب نے مجھ سے کہا کہ "شوکت اس روز مشاعرے میں آپ کی غزل سن کر میری بھتیجی زاہدہ نے صرف ایک مرتبہ ہی آپ کی غزل سن کر یاد کر لی ہے۔ بلکہ وہ بالکل آپ ہی کی طرح پڑھتی بھی ہے۔ آپ اس سے یہ غزل ضرور سنیں۔ چنان چہ میں نے زاہدہ خاتون سے یہ غزل سنی اور ان کی ذہانت کو

سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ آگے بڑھ کر یہی زاہدہ خاتون خود بہت اچھی شاعرہ نکلیں اور جن کی شادی چوہدری خلیق الزماں سے ہوئی ہے تو میں ہی ان کے نکاح کا وکیل بھی مقرر ہوا تھا۔

اب گویا والد صاحب کو خدا نے صبر کی توفیق عطا کر دی تھی کہ جوان بیٹا شاعر نکل گیا تھا تو مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے اور اب وہ اس سلسلہ میں اپنی قسمت پر شاکر تھے۔ گھر پر اگر کبھی کوئی شاعر دوست آ جاتا تو اس کو بھی گوارا کر لیتے تھے بلکہ اس حد تک گوارا کر لیتے تھے کہ ان ہی دنوں آگرہ سے مولانا سیماب نے اپنے شاگرد رشید بلکہ شاگرد قابل دید حضرت ساغر نظامی کی ادارت میں ایک رسالہ ”پیمانہ“ کے نام سے نکلوایا تھا اس رسالے کی بدولت میرے ساغر صاحب سے خط و کتابت کے مراسم قائم ہو چکے تھے کہ ناگاہ ایک دن میری عدم موجودگی میں وہ آگرہ سے لکھنؤ آ دھمکے۔ میرا اس زمانے میں باہر کوئی کمرہ تھا نہیں وہ سیدھے والد محترم کے کمرے میں پہنچے مجھ کو دریافت کیا اور جب یہ معلوم ہوا کہ میں موجود نہیں ہوں تو والد صاحب سے فرمایا کہ شوکت صاحب کا مہمان ہوں نیند سے سخت بدحواس ہو رہا ہوں لہٰذا آپ اپنا بستر چھوڑ کر اندر تشریف لے جائیں اور میرے لیے یہ بستر خالی کر دیں۔ وہ نہایت خاموشی سے اٹھے اور اندر جا کر والدہ صاحبہ سے فرمایا کہ:

> ”باہر کا کمرہ صاحب زادے کو دے دو۔ مجھ سے زیادہ ان کے لیے ضروری ہو گیا ہے میں اندر ہی گزر بسر کر لوں گا۔ آگرہ سے ان کا ایک دوست آ گیا ہے کھانے میں ذرا اہتمام کرا دینا۔“

میں جب گھر واپس آیا تو والدہ محترمہ نے سارا ماجرا سنایا۔ باہر جا کر دیکھا تو ساغر صاحب والد محترم کا بستر لپیٹ کر اپنا بستر بچھا چکے ہیں اور اپنے تکیوں پر عطر مجموعہ مل رہے ہیں اور خود بھی نہایت:

خراماں خراماں معطر معطر

قسم کے ”شے لطیف“ ہیں سر پر ریشمی سنہری بالوں کا ایک ٹوکرا سا رکھے ہوئے ایک پیکر لطیف بصد رعنائی میرے سامنے موجود تھا۔ میں نے ”السلام علیکم“ کے بعد اپنا تعارف کرایا کہ میں ہوں

شوکت۔ ساغر صاحب نے اپنا دست ناز مصافحہ کے لیے میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے فرمایا۔"

"آپ کا جو ہیولہ میرے جوف دماغ میں محدود تخیل تھا وہ اس سے قطعاً مختلف تھا جو آپ اصالتاً ہیں۔"

ارادہ کیا کہ دوڑ کر اندر جاؤں اور لغت اٹھالاؤں مگر پھر خیال آیا کہ ادبی گفتگو مجھ کو بھی کرنا چاہیے۔ لہٰذا عرض کیا:

"اور آپ کا پیکر جمیل جو میرے تصورات میں رقصاں تھا وہ آج بغیر صفت میری نگاہوں کو خیرہ کر رہا ہے۔"

ساغر صاحب نے فرمایا: "چائے کی خواہش شدید محسوس کر رہا ہوں" عرض کیا "مع لوازم وفواکہات پیش کرنے کی سعی کرتا ہوں۔"

ساغر صاحب سے تفصیلی باتیں ہوئیں تو سلیس اردو کی نوبت پہنچ چکی تھی۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ میرے متعلق شدید غلط فہمی میں مبتلا اور اپنے رسالہ "پیمانہ" کی اقتصادی بدحالی کا مجھ سے مداوا حاصل کرنے آئے تھے مگر جب انہوں نے مجھ کو بالکل ایک ایسی چیل پایا جس کے گھونسلہ میں ماس نہیں ہوتا تو صرف اتنی اعانت چاہی کہ میں ان کے لکھنؤ سے گورکھ پور پہنچنے کا انتظام کر دوں جو کر دیا گیا اور ساغر صاحب گورکھ پور روانہ ہو گئے مگر میں ابھی ان کو اسٹیشن پر گورکھ پور کی گاڑی میں سوار کر کے واپس ہی آیا تھا کہ ایک اور بزرگ محترم مع اپنے سامان کے تشریف لے آئے۔ معلوم ہوا کہ آپ حضرت سیماب صدیقی الوارثی اکبر آبادی ہیں۔ حضرت علامہ نے آتے ہی ساغر صاحب کے متعلق کچھ حد سے زیادہ تشویش کے ساتھ دریافت فرمایا اور جب ان کو میں نے یہ بتایا کہ ابھی گورکھ پور روانہ ہوئے ہیں تو حضرت علامہ کچھ دل گرفتہ سے ہو کر بیٹھ گئے۔ دیر تک خاموش رہے۔ پھر کچھ سرد آہیں بھریں اور جس وقت مجھ سے یہ دریافت کیا کہ گورکھ پور دوسری ٹرین کس وقت جاتی ہے تو میں نے دیکھا وہ آب دیدہ بھی تھے۔ میں نے عرض کیا کہ دوسری ٹرین رات کو جاتی ہے جو صبح کو گورکھ پور پہنچتی ہے تو مولانا نے اپنے آپ کو بہت کچھ سنبھالتے ہوئے کہا:

"برا کیا ساغر صاحب نے بہت برا کیا' ان کو گورکھ پور نہ جانا تھا۔ وہاں وصل ہوگا۔"

میں یہاں ہجر دیکھ رہا تھا تو ظاہر ہے کہ وہاں وصل ہوگا مگر مولانا نے فوراً ہی مجھ کو سمجھایا کہ گورکھ پور میں وصل بلگرامی ہے وہاں ساغر صاحب کا جانا مناسب نہ تھا۔ مولانا بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ ساغر صاحب نے برا کیا۔ بہت برا کیا۔ ان کو وہاں نہ جانا تھا۔ میں نے چائے پیش کی۔ انکار، انکار، رات کا کھانا پیش کیا۔ انکار اور بات کے جواب میں یہی فقرہ کہ ساغر صاحب کو گورکھ پور نہ جانا تھا وہاں وصل ہوگا۔

مولانا کی حالت اس قدر قابلِ رحم ہو رہی تھی کہ رات جب وہ گورکھ پور جانے لگے تو والد محترم نے کچھ رقم مجھ کو دے کر فرمایا کہ بے چارے سخت پریشان ہیں تم گورکھ پور تک ان کو پہنچا آؤ لہٰذا مجھے مولانا کے ساتھ گورکھ پور جانا ہی پڑا۔

(۳)

ایک قدِ آدم ٹماٹر، چہرہ پر نہایت نورانی کھچڑی داڑھی جس میں بالوں نے کچھ گنگا جمنی کیفیت اختیار کر رکھی تھی کہ کچھ بال سفید ہو چکے تھے اور جو باقی تھے سفید ہونے کے لیے بھورا رنگ دے رہے تھے کہ اس تیزی میں زبان بار بار پھسلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور شبہ ہوتا تھا کہ خیر سے جناب ہکلے بھی ہیں حالاں کہ اچھے خاصے تھے صرف شوق یہ تھا کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ بات کر جائیں تاکہ سننے والا مفہوم کے پیچھے دوڑتا رہ جائے۔ یہ تھے مولانا وصل بلگرامی۔ سید مقبول حسن مولانا وصل بلگرامی۔ جن کو ساری دنیا تو وصل بلگرامی کہتی تھی مگر مولانا نیاز فتح پوری کو ایک دن یکا یک یہ خیال آیا کہ ان کی بیگم نے ہمیشہ ان کا تخلص نہیں بلکہ نام لیا ہے اور ساری دنیا کے خلاف وہ وصل صاحب کو مقبول صاحب کہتی ہیں۔ آخر نیاز صاحب کو پوچھنا پڑا کہ یہ قصہ کیا ہے۔ آخر کو ساری دنیا تو ان کو وصل صاحب کہتی ہے اور تم مقبول کہتی ہو۔ بیگم صاحبہ نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا "تو کیا میں گالی بکنے لگوں" میں نے وصل صاحب کو پہلی نظر میں واقعی ٹماٹر دیکھا تھا مگر بعد میں ایسے مرحلے بھی سامنے آئے جب وصل صاحب شعر

سناتے وقت یا کسی بحث میں حصہ لیتے ہوئے ٹماٹر اور چقندر کا مصالحتی فارمولہ بنے ہوئے نظر آئے۔ گورکھ پور کے رئیس اعظم مولوی سبحان اللہ صاحب کی پاکستان کی مشہور سوشل ورکر بیگم سروری عرفان اللہ کے خسر محترم تھے جن کے علمی تبحر اور جن کی ادب نوازی کا بڑا شہرہ تھا اور جن کے گرد اہلِ علم و اہلِ ادب کے جمگھٹے رہتے تھے۔ ساری رات محفل گرم رہتی تھی اور سحری کی ٹھنڈک کھا کر اہلِ محفل سونے کے لیے جا سکتے تھے اور چوں کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ساری رات کاٹ کر صبح کے وقت سوتے تھے لہٰذا ظاہر ہے کہ ناشتہ غائب ہوتا تھا اور دوپہر کا کھانا سہ پہر کو چار بجے ہی کھایا جا سکتا تھا مگر جس وقت میں مولانا سیماب کے ساتھ وصل صاحب کے یہاں پہنچا ہوں ہر چند کے صبح کے سات بجے تھے مگر وصل صاحب نہ صرف جاگ رہے تھے بلکہ ایک کرسی پر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے گویا ''داغ فراق، وصحبت شب کے جلے ہوئے'' بیٹھے ہیں اور ساغر صاحب اس طرح سو رہے تھے کہ گویا:

حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

وصل صاحب نے سیماب صاحب کا نہایت سرد مہری سے خیر مقدم کیا مگر مولانا سیماب نے اس کا نوٹس لیے بغیر ساغر صاحب کو بے دار کیا جو فتنہ بن کر بے دار ہوئے اور رفتہ رفتہ قامت بن کر وصل صاحب پر ٹوٹ پڑے اور سیماب صاحب سے ان کے متعلق قاموسی زبان میں جو کچھ فرمایا اس کا مفہوم جو میرے پلے پڑ سکا وہ یہ تھا کہ:

''جس مہم پر وہ گورکھ پور آئے تھے وہ کب کی کامیاب ہو چکی ہوتی، اگر وصل صاحب بقول ساغر صاحب کے تعاون میں بخل سے کام نہ لیتے۔''

معلوم یہ ہوا کہ مولوی سبحان اللہ نے رسالہ ''پیمانہ'' کی اعانت کے لیے ایک رقم کی منظوری دے دی تھی مگر وصل صاحب نے اس رقم کی فراہمی کے ایسے عذر پیش کیے کہ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ یہ سن کر وصل صاحب نے ٹماٹر سے چقندر بننے کی کوشش کرتے ہوئے جلدی جلدی نہ جانے کیا کیا کہا۔ کچھ منہ سے جھاگ اڑا، کچھ کرسی کے ہتھے پر گھونسے مارے، کچھ گلے کی رگیں پھیلائیں اور آخر میں ان کے یہ الفاظ پلے پڑ سکے ''تہمت ہے، افترا ہے، بہتان

تراشی ہے۔" ساغر صاحب نے اپنے چوڑی دار پاجامہ کی چوڑیاں مرتب کرتے ہوئے فرمایا، مولانا امین آپ کی ان باتوں سے متسلی نہیں ہوسکتا۔ مولانا سیماب نے جیب سے نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا متسلی؟ خوب، بہت خوب، کیا اختراع کیا ہے، کیا اجتہاد کیا ہے۔ متسلی نہیں ہوسکتا۔ یعنی تسلی نہیں ہوسکتی مجھ کو۔ اس لفظ کو رواج میں لانا چاہیے اور وصل صاحب اسی پر الجھ پڑے کہ یہ لفظ غلط ہے اور غلطی کو رواج دینا شدید تر غلطی۔ اس کا نتیجہ ایک نئی جنگ کی صورت میں نمودار ہوا۔ میں اس جنگ کا اپنے کو واحد شہید سمجھ رہا تھا اس لیے کہ دس بج چکے تھے اور ناشتہ اس طرح غائب تھا کہ اپنے معدے کو کسی طرح "متسلی" نہ کرسکتا تھا۔ خدا خدا کر کے نہایت واہیات قسم کا ایسا ناشتہ سامنے آیا جو خود ہی ہمارا ناشتہ کر جانے والا نظر آرہا تھا مگر اس وقت یہ بھی غنیمت نظر آیا۔ اس ناشتہ کے دوران اور ناشتہ کے بعد بھی میدانِ جنگ گرم رہا بلکہ جب رات کو میں اس میدان سے بھاگا ہوں تو یہ جنگ پوری گہما گہمی سے جاری تھی۔

یہ تھی وصل صاحب سے پہلی ملاقات مگر اس کے بعد جب وہ مولوی سبحان اللہ صاحب کے یہاں سے سبکدوش ہو کر مستقلاً لکھنؤ آگئے اور اپنا ادبی ماہنامہ "مرقع" کے نام سے جاری کیا اور اپنا "مقبول المطابع" قائم کیا تو ان سے بڑی تفصیلی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور اب معلوم ہوا کہ وہ تو واقعی نپولین کے قسم کے آدمی ہیں جن کی لغت میں لفظ ناممکن ہے ہی نہیں مشکلات کے پہاڑ ان کے سامنے پیش کر دیجیے وہ ان پہاڑوں کو پانی کی طرح بہا دیں گے اور اس پانی میں تیرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اپنی بزرگی اور اپنی داڑھی سے جتنا کام وصل صاحب نے لیا ہے شاید ہی کبھی کسی نے لیا ہو ایک دو واقعات ہوں تو بیان بھی کیے جائیں وہاں تو روز کا مشغلہ ہی یہ تھا کہ کوئی مشکل پیدا کی جائے اور اس پر عبور حاصل کی جائے۔ خطروں سے کھیلنا اور سلامتی سے نکل جانا اس فن کار کا ایسا کمال تھا جو کسی اور میں کبھی نہ دیکھا گیا۔ اس کمالِ فن کی ایک آدھ مثال دیے بغیر یہ بتانا ہی ناممکن ہے کہ وہ کیا قیامت تھا۔

ایک شاعر مگر ساتھ ہی ساتھ کھاتے پیتے دوست کو یکایک صاحب دیوان بننے کا شوق پیدا ہوا اپنی زندگی بھر کی ادبی کمائی یعنی اپنے کلام کو بڑی احتیاط سے یکجا کیا۔ مخلص احباب

سے اس کا انتخاب کرایا اور اس کی طباعت کا مہتم بالشان پروگرام بنا کر سب سے پہلے وہ کانپور سے چل کر دہلی پہنچے تاکہ رسالہ "نئی روشنی" کے کاتب سے اس کی کتابت کرائیں جس کا خط ان کو بے حد پسند تھا۔ دہلی میں محض کتابت کرانے کے لیے ہوٹل میں مہینوں قیام کیا اور زیر بار ہوتے رہے مگر اپنے کلام کی کتابت اپنی ہی نگرانی میں کراتے رہے۔ خدا خدا کر کے جب یہ دیوان کتابت کے مرحلے سے نکل آیا تو اب ان کو ایک ایسے مطبع کی ضرورت پیش آئی جو اسی احتیاط اور اسی توجہ کے ساتھ طباعت کی منزل بھی سر کرا دے، نظر انتخاب وصل صاحب کے "مقبول المطابع" پر پڑی اس لیے کہ وصل صاحب دیرینہ کرم فرما بھی تھے اور طباعت کے معاملے میں اپنے مطبع کا بھرم بھی قائم کر چکے تھے۔ لہٰذا دیوان چھپوانے کے لیے دیوانے دہلی سے سیدھے لکھنؤ پہنچے اور وصل صاحب سے مل کر سارا ماجرا کہہ سنایا کہ اس طرح سے کتابت کرائی ہے اور کتابت کے شایانِ شان صرف آپ ہی کا مطبع اس کی طباعت کرا سکتا ہے۔ وصل صاحب نے کتابت دیکھی، اس کو چوما، آنکھوں سے لگایا اور بار بار وجد کی سی کیفیت طاری کرتے رہے کہ واقعی موتی پروئے ہیں اس کاتب نے کیا نوک پلک ہے اور کیا دائرے ہیں، اور فوراً پریس مین کو آواز دے کر اس کو نہایت تفصیلی لیکچر دیا کہ پہلے ان صاحب کو دیکھ لو، یہ میرے صرف دوست نہیں بلکہ بھائی بھی ہیں، محسن بھی ہیں، مربی بھی ہیں اور زندگی میں آج یہ پہلی سعادت مجھ کو حاصل ہوئی ہے کہ میں بھی ان کے کسی کام تو آسکوں، لہٰذا یہ کاپیاں آپ لے جائیں اور ان سب کو جموا دیں تاکہ کل ہی میں بھائی صاحب کو پروف اٹھوا کر دے دوں۔ پریس مین نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر وصل نے اس کو ڈانٹ دیا کہ جی نہیں کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں ہے۔ سب کام روک کر یہ کام مقدم سمجھا جائے میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ پریس مین کو رخصت کر کے ان صاحب کو بھی دوسرے دن تشریف لانے کے لیے کہہ کر رخصت کر دیا۔

ان صاحب کے جاتے ہی وصل صاحب کے برادرِ عزیز مرتضیٰ صاحب نہایت آگ بگولہ تشریف لائے کہ:

> ”بھائی صاحب آپ کا بھی جواب نہیں مجھ کو بھیجا کہ جا کر ووٹروں کی
> لسٹ کا کام لاؤں اور یہاں سارے پتھروں پر آپ۔ دیوان کی
> کاپیاں جموا بیٹھے ہیں اب۔ اس لسٹ کی کاپیاں میں اپنے سر پر
> جمواؤں۔“

وصل صاحب کو بھی اب اس نازک صورتِ حال کا اندازہ ہوا کچھ سر ہلایا۔ کچھ داڑھی کھجائی اور اس کے بعد پریس مین کو آواز دے کر حکم دیا کہ وہ سب پتھر کاٹ دیے جائیں۔ وہ زمانہ آفسیٹ کا تو تھا نہیں کہ کتاب محفوظ رہ سکتی زیادہ سے زیادہ چربے اٹھوائے جا سکتے تھے مگر وصل صاحب نے اس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی اور اس ساری کتابت اور اس کے سلسلہ کی ساری محنت پر اپنے ایک ہی حکم پر پانی پھیر دیا۔ سارے پتھر کاٹ دیے گئے اور ووٹروں کی لسٹ کا کام شروع کر دیا گیا۔ دوسرے دن مقررہ وقت پر جب وہ دوست آئے تو دیکھا کہ وصل صاحب ایک کرسی پر سرد آہوں میں لپٹے اور آنسوؤں میں ڈوبے بیٹھے ہیں۔ سلام کے جواب میں ایسا ”وعلیکم السلام“ کہا کہ ان کو پورا یقین ہو گیا کہ ان کے یہاں کوئی موت واقع ہوئی ہے۔ ان صاحب نے بڑی دیر تک ہمت کرنے کے بعد آخر دریافت کیا کہ ”خیریت تو ہے۔“

اس کے جواب میں وصل صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے اور ان سے کہا:

> ”میرے بھائی میں نے آج تک آپ سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگی ہے، کوئی برادرانہ ضد نہیں ہے مگر آج ضد کر رہا ہوں کہ آپ اپنا یہ جوتا اتار لیں اور میرے اس پھٹکار زدہ منہ پر مارنا شروع کر دیں۔“

ان صاحب نے سخت حیران ہو کر کہا ”وصل صاحب! آپ کیا فرما رہے ہیں۔“

وصل صاحب اب بھڑک اٹھے تھے:

> ”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بخدا ٹھیک کہہ رہا ہوں، یہ کام آپ کو کرنا پڑے گا میں اسی قابل ہوں میرے پریس والوں نے مجھے اس قابل کر دیا ہے۔ ہائے کس محنت سے آپ نے کتابت کروائی،

> کتنا وقت اور کتنا روپیہ صرف کیا، غریب الوطن بن کر کتابت
> کراتے رہے اور ان کم بختوں نے اس ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔
> سارے پتھر کاٹ دیے۔ چربہ تک نہ اٹھایا۔ ماریے جوتے،
> جوتے ماریے ورنہ لیجیے۔"

اور یہ کہہ خود اپنے ہی جوتے اپنے دونوں ہاتھوں میں پہن کر اب جو اپنے منہ پر مارنا شروع کیے ہیں تو سارا چہرہ لہولہان کر لیا۔ کسی طرح قابو ہی میں نہ آتے تھے۔ وہ صاحب ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ اس کتاب اور دیوان کی طباعت دونوں سے باز آنے کا اعلان کر رہے ہیں وصل صاحب ہیں کہ مجنونانہ انداز میں اپنا منہ جوتوں سے پیٹتے ہی جا رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے یہ طوفان تھما تو وہ صاحب موقع غنیمت جان کر چپکے سے کھسک لیے اور جب وصل صاحب کو اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا کہ وہ جا چکے ہیں تو لوٹے میں پانی طلب کر کے ہاتھ منہ دھو کر نہایت اطمینان سے بیٹھ کر حقہ پینے لگے گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہے۔

رائے بریلی کا مشاعرہ اس وقت ختم ہوا جب ٹرین کا وقت بہت تنگ تھا بھاگم بھاگ ہم لوگ اسٹیشن تک پہنچے ہی تھے کہ ٹرین نے روانگی کے لیے رینگنا شروع کر دیا۔ اب اتنا وقت کہاں تھا کہ ٹکٹ لیتے۔ تار پھاند کر جو ڈبہ سامنے آیا اسی میں سب بھرا مار کر گھس گئے مگر سب کے بعد اس ڈبہ میں داخل ہونے والا ٹکٹ چیکر تھا جو پہلے تو بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اسے اپنا فرض یاد آیا اور اس نے ہم لوگوں سے ٹکٹ طلب کیے۔ ہم سب نے وصل صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ جو انتظاماً یا واقعی کچھ اونگھ رہے تھے۔ ٹکٹ چیکر نے ان کے آرام میں خلل ڈالا اور ان کا شانہ ہلا کر ٹکٹ طلب کیا۔ وصل صاحب نے آنکھ کھول کر اس کو دیکھا اور مسلسل دیکھتے رہے اس کے بعد ہاتھ اٹھا کر ایک نہایت شفقت آمیز قسم کا طمانچہ اس کے گال پر مارتے ہوئے کہا:

"بڑا لمبا ہو گیا ہے"

اور یہ کہتے ہوئے دوسروں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔ یہ اتنا سا تھا اور ایسا نامراد کہ جب میں نے گود میں لیا اس نے میرے نمازی کپڑے غارت کیے اور ان کے باوا جان

ان کی اسی ادا پر فریفتہ تھے۔ ہیں کہاں وہ بڑے میاں؟

اس بے چارے نے نہایت سعادت مندی سے کہا:

”ان کا تو تین سال ہوئے انتقال ہو چکا ہے۔“

اور اس محب صادق کی وفات کی خبر سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آخر اپنے کو سنبھال کر فرمایا۔ ”انتقال تو وہیں ہوا ہوگا۔“

اس نے کہا: ”جی ہاں مرزا پور میں انتقال فرمایا۔“

وصل صاحب نے کہا:

> ”مرزا پور میں یہ حال تھا کہ بیچ میں سڑک ادھر میرا مکان اور ادھر ان کا، ہر وقت کا ساتھ اٹھنا بیٹھنا، اتنے تعلقات مگر کسی مردود کو اس کا نام تک یاد رہا ہو، بودم کہا کرتا تھا ہمیشہ اور بودم ہی کہتا رہا۔ اپنی والدہ سے کہنا کہ مقبول چچا ملے تھے وہ بتائیں گی سارے حالات۔
>
> ہاں تو بیٹا تم ہم لوگوں سے دام لے لو۔ ٹکٹ تو جلدی میں ہم خرید نہیں سکے۔ چائے تک نہیں پی ہے۔ اس بھاگم بھاگ میں۔“

اس نے مارے سعادت مندی کے نہ صرف یہ کہ ٹکٹ نہیں بنائے بلکہ لکھنؤ پہنچ کر اس وقت تک پلیٹ فارم کے باہر جانے نہیں دیا جب تک سب کو چائے نہیں پلا دی۔

ایک واقعہ اور جس کے بغیر وصل صاحب کی شخصیت تشنہ رہ جائے گی۔ ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے ہم چند احباب ٹرین کے انتظار میں کانپور کے اسٹیشن پر ٹہل رہے تھے۔ رات کے بارہ بج چکے تھے کہ چند انگریز ڈریس سوٹ میں ملبوس ایک نوخیز حسینہ کے ساتھ آئے اور اس لڑکی کو اپنے گھیرے میں لے کر کھڑے ہو گئے۔ معلوم نہیں کہ کیا سوجھی کہ میں نے وصل صاحب سے کہا کہ:

> ”مولانا آپ کے لیے کوئی بات ناممکن تو ہے نہیں مگر کیا اس لڑکی کی پیشانی چوم سکتے ہیں۔“

وصل صاحب نے اس امکان پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لیے داڑھی کھجائی۔ وہ غور و فکر کے لیے داڑھی سے مشورہ ضرور لیتے تھے۔ میں نے اور دوسرے احباب نے ان کو سنجیدہ دیکھ کر کہا:

''خدا کے لیے یہ غضب بھی نہ کیجیے گا۔ ہم اپنے الفاظ واپس لیتے ہیں۔

مگر وصل صاحب نے کہا:

''تم میرا امتحان لیتے ہو تو میں یہ امتحان ضرور دوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ اُدھر روانہ ہوئے اور ہم لوگ مخالف سمت میں ان سے غیر متعلق بن کر چل دیے اور دور سے جا کر دیکھا کہ وصل صاحب نے دونوں انگریزوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے ہٹا کر وہ دائرہ توڑا اور اس لڑکی کے قریب جا کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی پیشانی کو اس طرح چوما ہے کہ وہ چیخ پڑی مگر اس سے زیادہ زور سے وصل صاحب نے دھاڑ ماری کہ:

''ہائے بالکل میری زہرہ ہے۔ میری بچی۔ وہی ناک، وہی نقش، وہی قد، وہی قامت۔''

اس عرصہ میں وہاں ایک بھیڑ لگ چکی تھی اور اب ہم لوگ بھی وہاں پہنچ چکے تھے وصل صاحب ایک انگریز کو سمجھا رہے تھے کہ ابھی چند دن ہوئے میری بچی مر چکی ہے۔ وہ اس بچی سے اس قدر مشابہ تھی کہ اس وقت میں اس بچی کی شکل میں اسی کو دیکھ رہا ہوں۔ عالم یہ تھا کہ کوئی وصل صاحب کو رومال کی ہوا دے رہا تھا، کوئی ان کی پیٹھ تھپتھپا رہا تھا اور وہ لڑکی نہایت شکستہ اردو میں ان کو سمجھا رہی تھی کہ ''ہم تمہارا بیٹی ہے، ہم تمہارا جاورا (زہرہ) ہے۔'' وصل صاحب اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

یہ عجیب و غریب شخصیت اور انجام بخیر کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ کا دامن تھامتے ہی وصل کچھ کے کچھ ہو گئے آخر کار اسی دامن کے زیرِ سایہ تھانہ بھون ہی میں آخری سانس لی اور دنیا کو حیران چھوڑ گئے کہ وصل اس طرح واصل بحق ہو سکتے ہیں۔

(۴)

وصل صاحب کا ذکر ختم ہو تو کسی اور کا ذکر شروع کیا جائے مگر یہ ذکر نہ اتنا مختصر ہے کہ اتنی جلدی ختم ہو جائے، نہ اتنا محدود کہ اس میں کسی اور کے ذکر کی گنجائش ہی نہ نکلے۔ میں تو جس کسی کا ذکر چھیڑنا چاہتا ہوں، وصل صاحب کو اس ذکر میں موجود پاتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ گورکھپور سے لکھنؤ آجانے کے بعد وصل صاحب ایک انسان بلکہ ایک انجمن بن کر رہ گئے تھے۔ اور لکھنؤ کے تمام شعری وادبی حلقہ کی ٹھیکے داری اس حد تک ان کے حصے میں آگئی تھی کہ لکھنؤ کی ادبی محفلیں تو درکنار لکھنؤ سے باہر بھی اگر کوئی مشاعرہ ہوتا تھا تو بانیان مشاعرہ لکھنؤ کے شعرا کو مدعو کرتے۔ فرداً فرداً ہر شاعر کے گھر جانے کی بجائے سیدھے وصل صاحب کی خدمت میں پہنچتے تھے اور وصل صاحب ہی سب کی طرف سے وعدہ کر کے بانیانِ مشاعرہ کی طرف سے آنریری میزبان بن جایا کرتے تھے اور اب یہ ان کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ لکھنؤ کے شعرا کو دعوت نامہ پہنچائیں۔ ان کو مشاعرے کی شرکت کے لیے راضی کریں اور اگر وہ شرافت کے ساتھ راضی نہ ہوں تو ذرا دھمکا کر، ڈانٹ ڈپٹ کر، بہر حال کسی طرح راضی کریں اور اپنی قیادت میں ان کا قافلہ لے کر روانہ ہوں۔ راستے میں وہ ہر شاعر سے فرداً فرداً اس کی طرحی غزل سنتے تھے۔ کسی سے کہتے کہ: ''اپنا ساتواں شعر کاٹ دیجیے۔'' کسی کو نویں شعر پڑھنے کی ممانعت ہوتی تھی تو کسی کو گیارہویں شعر کے نہ پڑھنے کی تاکید کی جاتی تھی اور اگر اس کی وجہ پوچھی جائے تو نہایت سادہ جواب دیا جاتا تھا کہ یہ میں پڑھوں گا۔ حالاں کہ خود ان کے پڑھنے کے لیے ایک نہیں کئی غزلیں ان کے جیب میں ہوتی تھیں جن کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کہاں سے آئیں۔ بس یہی سمجھ کر رہ جانا پڑتا تھا کہ:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

مشاعرے سے کچھ دیر پہلے وصل صاحب ان سینکڑوں اشعار میں سے اپنے لیے ایک تیرہ شعر کی غزل تیار کرتے ہیں جو ظاہر ہے کہ عطر مجموعہ کے قسم کی ہوتی تھی اور حاصل مشاعرہ سمجھی جانے کی مستحق ہوتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وصل صاحب اس کو پڑھ کر غارت کر دیں۔ اس لیے کہ وہ غزل پڑھتے نہیں تھے بلکہ ''غزل ڈانٹتے'' تھے۔ چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ آنکھوں

سے خون چھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں۔ منہ سے جھاگ اڑتا تھا اور وہ زانوں پیٹ پیٹ کر اس طرح ایک ایک شعر پڑھتے تھے۔ گویا اس شعر کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہے ہیں اور طے کر چکے ہیں کہ آج یہ شعر نہیں یا میں نہیں۔ ان کی شعر خوانی کا اندازہ ہسٹیریا کے دورے سے بہت ملتا جلتا تھا مگر کچھ دن کے بعد ان کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی اچھی سے اچھی غزل اس خوں خوار شعر خوانی سے ذبح ہو کر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے خود پڑھنا ترک کر دیا تھا اور ہر مشاعرے کے لیے کسی نہ کسی خوش آواز شاعر کو پہلے سے طے کر لیا کرتے تھے کہ وہی ان کی غزل پڑھے گا اور وہ صرف داد کی رسید کے طور پر سلام کریں گے۔

وصل صاحب جب سے شاعروں کے تھوک فروش تاجر یا ٹھیکے دار بنے تھے انہیں کے در دولت پر ہر چھوٹے بڑے شاعر سے ملاقات ہوتی رہتی تھی کہ آج ان کے یہاں حضرت ریاض خیر آبادی ٹھہرے ہوئے ہیں تو کل حضرت جگر مرادآبادی یہاں سے نکل بھاگنے کے لیے پھڑ پھڑا رہے ہیں مگر راہِ فرار نہیں ملتی۔ ایک دن کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے جوش ملیح آبادی ان کی حراست میں آئے ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ جوش صاحب سے رفیع احمد مرحوم کے ساتھ بارہا ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور یہ ملاقاتیں تکلف کے حدود کو کب کا ختم کر چکی تھیں مگر وصل صاحب کے شکنجہ میں ان کی بے بسی کا جو تماشہ نظر سے گزرا وہ پہلے کبھی نظر نہ آیا تھا۔ وصل صاحب ان کو کانپور کے ایک مشاعرے میں لے جانے کے لیے پکڑ لائے تھے اور جوش صاحب ان سے رحم کی اپیلیں کر رہے تھے کہ وہ کسی طرح ان کو بخش دیں۔ منت سماجت سے کام نہ چلا تو جوش صاحب نے ''ٹھنوری'' دکھانے کی کوشش کی کہ:

> ''نہیں صاحب اس مشاعرے کی شرکت کے لیے آمادگی کی ایک
> رمق بھی میں اپنے اندر پاتا یہ بالجبر اغوا ہے۔''

وصل صاحب نے تڑک کر پوچھا: ''کیا کہا؟'' اور فوراً اپنے مصنوعی دانتوں کی پلیٹیں زبان سے ٹھیل کر منہ سے باہر نکال دیں اور اب جو یہ نقلی دانت بجائے ہیں تو جوش صاحب نے ایک جھرجھری لے کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا:

"اف اف جاؤں گا صاحب یقیناً جاؤں گا۔ افوہ جاؤں گا اور جہاں وصل صاحب نے اپنے یہ دانت ضبط کیے جوش صاحب نے پھر رسیاں تڑانا شروع کر دیں مگر توبہ کیجیے ان باتوں سے کہیں ان کو وصل صاحب سے رہائی حاصل ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد کانپور جانے والی ٹرین میں وصل صاحب اور جوش صاحب ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے مگر اب بھی وصل صاحب تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے دانت باہر نکال کر بجاتے تھے اور جوش صاحب جھرجھری لے کر اور "اف" کہہ کر آنکھیں بند کر لیتے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد وصل صاحب سے کچھ کہتے تھے جسے وصل صاحب لکھ لیتے تھے پھر جوش صاحب پہلو بدل کر کہتے تھے کہ "بس صاحب بس" اور وصل صاحب کو پھر دانت نکال کر بجانا پڑتے تھے۔ کانپور تک یہی سلسلہ قائم رہا اور کانپور کے اسٹیشن پر جب جوش صاحب ٹرین سے اترے ہیں تو سخت پسپا نظر آ رہے تھے گویا راستہ بھر ان سے چکی پسوائی گئی ہو۔ مشاعرہ تو خیر بخیر و خوبی ختم ہو گیا لیکن صبح ہوتے ہی جوش صاحب تمام احباب کو گھیر کر دریا کی سیر کو لے گئے اور گنگا گھاٹ پر پہنچ کر کشتی کی سیر کے لیے مچل گئے۔ آخر ایک کشتی کرایہ پر لی گئی اور اس میں ہم سب بیٹھ کر اس پار سے اس پار جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ گنگا ان دنوں باڑھ پر تھی۔ نہایت خوفناک بھنور پڑ رہے تھے اور ملاح کا دل ہی جانتا ہوگا کہ وہ دھارے کو کاٹ کر کس طرح کشتی کو لے جا رہا تھا کہ عین بیچ دھارے میں پہنچ کر جوش صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی کہ ایک دم کشتی میں کھڑے ہو گئے اور پہلے تو ایک مختصر سی مگر نہایت ولولہ انگیز تقریر کی جس کے ممدوح وصل صاحب تھے کہ اس شخص نے کل سے آج تک مجھ پر نہایت انسانیت سوز مظالم کیے ہیں اور مجھ کو زندگی سے اس حد تک بے زار کر دیا ہے کہ اب میں خودکشی کی جرأت آزما بزدلی کے لیے آمادہ ہو چکا ہوں اور یہ کہہ کر انہوں نے کشتی کے ایک کنارے پر ایک پیر اور دوسرے کنارے پر دوسرا پیر رکھ کر ایک پوربی گیت چھیڑ دیا کہ:

اب نہ لکھو سیاں چٹھیاں گوں کی...... اب نہ لکھو
چٹھیاں پڑت ہورے انسوا بہت ہیں

انسوا بہت جیسے ندیاں سون کی
اب نہ لکھو سیاں چٹھیاں گوں کی........ اب نہ لکھو

وہ شوق سے گاتے کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر انہوں نے ساتھ ہی ساتھ رقص بھی شروع کر دیا جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ ناؤ ڈگمگانے لگی اور ملاح نے چیخ کر کہا ڈوب جائے گی ناؤ، صاحب یہ نہ کرو، مگر جوش صاحب کا جواب یہی تھا کہ ہم ڈوبنے ہی کے لیے یہ کر رہے ہیں اور پھر جو اپنے دونوں پیروں کو جنبش دی ہے تو ہم سب کو موت کا ایک ایسا جھونکا آیا ہے کہ ہر زبان پر کلمۂ شہادت تھا۔ مولانا آسی نے سنجیدگی سے برامان کر کہا:

‘‘بیٹھ جایئے جوش صاحب یہ نہایت مہلک مذاق ہے۔’’

جوش صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

‘‘غالب کی شان دار سنجیدگی کو مذاق کہہ رہا ہے۔’’

مولانا آسی کی شرح دیوان غالب اسی زمانہ میں نکلی تھی نشتر سندیلوی نے گھبرا کر کہا:

‘‘یہ کیا بے ہودگی ہے۔’’

اور جوش صاحب نے بڑے رعب سلطانی کے ساتھ کہا:

‘‘یہ کس گستاخ کی آواز ہے۔ میں حکم دیتا ہوں کہ وہ میرے قدموں پر جھک جائے ورنہ یہ لو۔’’

اور اب جو ایک ہچکولہ کشتی کو دیتے ہیں تو نشتر سندیلوے خدا کے لیے جوش بس کرو کہتے ہوئے واقعی ان کے قدموں پر جھکے ہوئے تھے۔ اب وصل کی باری تھی۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ: ‘‘میں کہتا ہوں جوش صاحب۔’’

کہ جوش صاحب نے کڑک کر کہا:

‘‘خاموش! خبردار جو ایک لفظ بھی زبان سے نکالا۔ نکالو اپنی دانت بالکل نکالو۔ اپنی ہتھیلی پر درندے کے اس مصنوعی جبڑے کو رکھ لو۔ کروان کو دریا برد۔ ان ملتجی نظروں سے دیکھ رہے ہو تو ان دانتوں کو

صرف گنگا اشنان کراؤ۔ اب رکھ لو ان کو جیب میں۔''

اور وصل صاحب ان کے ایک ایک حکم کی تعمیل کرتے رہے اور اس کے بعد جوش صاحب دوسروں کی طرف مخاطب ہوئے۔ اے موت سے ڈرنے والے بزدل شوکت تھانوی، اپنی ناک سے کشتی کے تختہ پر دستخط کر۔

میں ایک طرف سہا ہوا تھا اور واقعی اختلاج قلب میں مبتلا تھا۔ طرح طرح کے خیال دل میں آ رہے تھے کہ جب اس غرقابی کی خبر گھر پہنچے گی تو گھر میں کیسا کہرام مچے گا۔ میری دکھیاری ماں کیسی پچھاڑیں کھائے گی۔ اس غم کے پہاڑ کو میرا بوڑھا باپ کیوں کر برداشت کرے گا۔ میری چاہنے والی بہن اپنا کیا حال کرے گی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جان بخشی کی صرف یہی صورت نظر آئی کہ کشتی کے تختہ پر ناک سے لکیریں کھینچنا شروع کر دی۔ امین سلونوی جو غالباً مرے ہوئے بیٹھے تھے اپنی مونچھوں کا سارا تاؤ بھول چکے تھے اور اس دنیائے فانی کو بڑی حسرت سے دیکھ رہے تھے کہ اپنا نام سن کر چونکے۔ جوش صاحب نے ان کو للکار کر کہا:

اور جب ان کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی تو جوش صاحب نے کشتی کو ایک مرتبہ ڈگمگا کر نادری حکم دیا کہ:

''بیان کرو اپنا شجرہ''

اور امین سلونوی نے اس وقت اور اس عاجزی سے ''یاد نہیں آتا جوش صاحب۔'' کہا ہے کہ جوش صاحب کی ساری اداکاری ختم ہو گئی اور وہ بے ساختہ ہنستے ہوئے بیٹھ گئے۔ بات یہ تھوڑی ہی دیر کی تھی مگر معلوم ہوتا تھا کہ ہم سب پر مصیبتوں اور آزمائشوں کی صدیاں بیت گئی ہیں۔ گنگا کی خوفناک طغیانی کیفیت، ملاح تک کا بار بار یہ کہنا کہ بس ڈوبتی ہے ناؤ مگر اس کے باوجود جوش صاحب کا یہ ہولناک کھیل ایسا نہیں تھا جس نے کسی کے حواس بجا رکھے ہوں۔ یوں تو بھی اپنی چوکڑی بھول چکے تھے مگر مجھے تو سب سے زیادہ اپنی ہی کیفیت کا علم ہے کہ میں یہ سمجھ چکا تھا کہ اس مشاعرے میں ہماری موت ہم کو کھینچ لائی تھی اور یہی حضرت ملک الموت ہیں جن کو اب تک جوش ملیح آبادی سمجھتے رہے ہیں۔ کشتی سے اترنے کے بعد بھی دیر تک ہوش

بچا نہ ہو سکے اور یہ یقین مشکوک سا محسوس ہوتا رہا کہ اس گرداب بلا سے زندہ سلامت نکل آئے ہیں۔ تھوڑی دیر تک تو ایک مکمل سکوت طاری رہا اس کے بعد سب سے پہلا ''لاحول'' مولانا عبدالباری آسی نے بھیجا اور اس کی تائید نشتر سندیلوی نے کی کہ ''حد کر دی بخدا'' اور اب مولانا آسی ابل پڑے کہ:

> ''میں اس قسم کے مذاق کا عادی ہوں نہ اس قسم کے مذاق کو پسند کرتا ہوں اور یہ سارا کیا دھرا دراصل صاحب آپ کا ہے۔ میں اس پروگرام میں شرکت ہی نہ کرنا چاہتا تھا مگر آپ کی احمقانہ ضد نے مجھ کو حماقت میں مبتلا کیا ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان آخر فاصلہ کتنا رہ گیا تھا۔''

''یہ سوجھی کیا تھی آخر؟''

جوش صاحب نے بڑے متکبرانہ انداز میں جواب دیا:

اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ میرے عفو و درگزر کا نتیجہ ہے۔ احسان فراموش اقوام نے اپنے محسنوں کے ترحم کا ہمیشہ اسی طرح صلہ دیا ہے جیسا اس وقت کو دیا جا رہا ہے۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔

نشتر سندیلوی نے تو اس کے جواب میں کچھ تلخ باتیں کہیں مگر مولانا آسی تو اس حد تک ناراض ہو چکے تھے کہ نہ صرف اس وقت انہوں نے اس بحث میں کوئی حصہ نہ لینا چاہا بلکہ اس دن دوپہر کے کھانے میں جب جوش صاحب نے ان کی طرف مرغ کا ڈونگا بڑھایا تو انہوں نے نہایت خشمگیں نگاہوں سے جوش صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا ''خیر خیر'' اور مرغ تک ان کے ہاتھ سے لینا گوارا نہیں کیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مولانا آسی اس واقعہ کو مرتے دم تک نہ بھولے تھے اور کئی مرتبہ نہایت ناگواری کے ساتھ اس واقعہ کو دہرا چکے تھے بلکہ بعض اوقات تو یہ واقعہ ان کے ذہن میں ایسا بے محل تازہ ہو جاتا تھا کہ مولانا آسی کی اس یادداشت پر غصہ آنے لگتا ہے۔ مثلاً جوش صاحب کی ایک نظم ''فتنۂ خانقاہ'' کسی رسالے میں دیکھ کر میں

پھڑک اٹھا اور وہ نظم مجھ کو اس قدر پسند آئی کہ جو کوئی بھی مجھ کو ملتا تھا اس کو میں اس نظم کا ایک آدھ بند سناتا ضرور تھا۔ چنان چہ مولانا آسی کو میں نے اس نظم کے کچھ حصے سنائے۔ مولانا بڑے غور سے نظم سنتے اور جھومتے رہے اور جب نظم سن چکے تو کہنے لگے:

"ہاں صاحب، بہت بڑا فن کار ہے یہ شخص۔ الفاظ کا ایسا جادوگر بڑی مشکل سے پیدا ہوگا مگر وہ یاد ہے آپ کو کانپور والا واقعہ۔ زندگی ہی تھی جناب، جو ہم لوگ بچ گئے۔ اس دن میرے خیال میں وہ کوئی مراق کا دورہ اٹھا تھا جوش صاحب کو۔"

میں نے جل کر کہا کہ چھوڑیے مولانا اس قصہ کو۔ دیکھیے تو سہی کیا کہتا ہے ظالم کہ:

ہاتھ اس نے فاتحہ کو اٹھائے جو ناز سے
آنچل ڈھلک کے رہ گیا زلفِ دراز سے
جادو ٹپک پڑا نگہِ دل نواز سے
دل ہل گئے جمال کی شانِ نیاز سے
پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ ایک سمت پھر گئی
ایک پیر کے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی

مولانا نے بڑی فراخ دلی سے داد دی مگر داد دیتے دیتے پھر ایک دم سے کہنے لگے:

"میں حیران ہوں کہ اس دن جوش کو ہوا کیا تھا۔ ذرا غور تو کیجیے کہ کیسی بے کسی کی موت مرتے ہم سب۔"

عرض تو کیا کہ مولانا آسی مرتے دم تک اس نہ ہوسکنے والے حادثۂ کانپور کو نہ بھولے تھے۔ مگر اس حادثہ کے سلسلہ میں ایک صدمہ جوش صاحب کو بھی تھا کہ:

"ہائے آج رفیع احمد خان نہ ہوا۔ زندگی بھر کے بدلے آج چکا لیتا۔"

اللہ جانے رفیع احمد خان ہوتے تو اس موقع پر کیا کرتے جوش صاحب کا یہ جذبۂ انتقام بھی غلط نہ تھا۔ اس لیے کہ یہ واقعہ ہے کہ رفیع احمد خان نے جوش صاحب کے ساتھ بعض ایسے سلوک کیے تھے کہ ان کا بدلہ لینے کے لیے جوش ترستے ہی رہ گئے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ جس کا

میں خود عینی گواہ ہوں۔ اس حقیقت پر تھوڑی بہت روشنی تو ڈال ہی دے گا۔

دیوہ شریف میں حاجی وارث علی شاہ کا عرس تھا۔ عرس کے موقع پر دیوہ شریف میں بڑی چہل پہل ہوتی ہے۔ چناں چہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے جوش صاحب رفیع احمد خان مرحوم اور میں غالباً کچھ اور لوگ بھی ساتھ تھے۔ دیوہ شریف پہنچے وہاں سماع خانہ میں بیدم شاہ صاحب وارثی کی نظر جوش صاحب پر پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا جوش..... جوش۔ جوش کا ایک شور برپا ہو گیا اور جوش صاحب ہاتھوں ہاتھ اس بے پناہ ہجوم سے اٹھا کر بیدم شاہ صاحب کے پاس پہنچا دیے گئے اور ہم لوگوں کو کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ رفیع احمد خان مرحوم کو کسی اور پر نہیں البتہ جوش صاحب پر بے حد غصہ تھا کہ یہ حضرت بھی ہم لوگوں کو بھول گئے۔ جوش صاحب بڑی دیر کے بعد جب اس میلہ میں اپنے ڈنکے پٹوا کر سماع خانہ سے باہر آئے تو رفیع احمد خان نے ان سے کچھ نہ کہا اور بڑی محبت سے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھومنے لگے کہ ناگاہ ایک دخترِ نہایت ابوالہول قسم کی دیہاتی عورت جوش صاحب کے قریب سے جو گزری تو رفیع احمد خان نے اپنے اسی ہاتھ سے جو جوش کی کمر میں تھا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس "اف" قسم کی عورت کے بازو میں چٹکی لے لی۔ اس عورت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جوش صاحب کو وہ دوہتھڑ رسید کیا ہے کہ وہ چونک پڑے اور اب لگی وہ ہنکارنے۔ جوش صاحب کا دل ہی جانتا ہوگا وہ کس طرح اپنے کو بچا کر وہاں سے نکلے ہیں۔ رفیع احمد خان نے یہ انتقام لینے کے بعد صرف اتنا کہا کہ بڑی عزت افزائیاں ہو رہی تھیں جناب کی سماع خانہ میں اور ہم نیزمندانِ قدیم پیچھے دھکے کھا رہے ہیں۔ اس وقت ہم عالی مرتبت کو یاد نہ آئے۔ اب جو اس پہلوان نما عورت نے ایک ہی ہاتھ دکھایا ہے تو ہماری آڑ لے رہے ہو۔ جاتے کیوں نہیں اپنے بیدم شاہ وارثی کے پاس، جوش صاحب سمجھ چکے تھے کہ یہ ایک پٹھان نے ایک دوسرے پٹھان سے بدلہ لیا ہے۔ لہٰذا کہتے تو کیا کہتے۔ صرف یہی شکر ادا کرتے رہے کہ جس میلہ میں ابھی جوش کے آنے کی دھوم تھی۔ اس میں شکر ہے جوش کی اس عزت افزائی کے چرچے نہیں ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ جوش کی بھڑکتی ہوئی جوڑا اگر تھا تو رفیع احمد خان ہی تھا۔ جس کے تذکرے میں ایسے ایسے نہ جانے کتنے اور واقعات سامنے آئیں گے۔ ابھی تو اس یگانۂ روزگار کا ذکر ہی نہیں چھڑا۔

(۵)

ادھر یہ بے فکریاں جاری تھیں ادھر مشاعرہ بازیاں ہو رہی تھیں احباب نوازیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ جوانی کی راتیں تھیں امنگوں کے دن اور سمجھے یہ بیٹھے تھے کہ زندگی بے نکیل کے اونٹ کا نام ہے اور ادھر قدرت ہنس رہی تھی کہ برخوردار ایسے شکنجے میں کسے جاؤ گے کہ یہ ساری چوکڑیاں بھول جاؤ اور چھٹی کا دودھ زبان پر آ جائے۔ والد محترم جن کے دم سے یہ ساری بے فکریاں تھیں، ان کی بیماری نے اس ساری بے فکریوں کا نشہ ہرن کر دیا تھا۔ ان کی تیمارداری نے شعر و شاعری اور دوست و احباب سب کو یکسر بھلا دیا تھا۔ ان کی خدمت کرنے والے اور بھی موجود تھے مگر میں اس معاملہ میں بے حد خود غرض بنا ہوا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ یہ سعادت سوائے میرے کسی اور کو حاصل نہ ہو۔ مجھ کو وہ وقت کبھی نہ بھولے گا جب ایک شب کوئی دو بجے ہوں گے۔ میں والد محترم کا ''بڈ پین'' صاف کرنے جا رہا تھا۔ انہوں نے والدہ محترمہ سے کہا کہ:

> ''تم اس کی طرف سے متفکر رہتی تھی نا کہ یہ نہایت غیر ذمہ دار اور
> بے فکرا ہے۔ اب دیکھ لو کہ یہ میرا کیسا ذمہ دار تیماردار بنا ہوا ہے۔''

وقت انسان کو سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک ایسا وقت بھی آ رہا ہے جو مجھ کو بہت کچھ سکھائے گا۔ آخر کار وہ نحس وقت بھی آ گیا کہ میرے سر سے میرے چاہنے والے باپ کا سایہ اٹھ گیا اور مجھ کو یکا یک محسوس ہوا کہ میرے سر پر نہ آسمان ہے اور نہ پیروں تلے زمین اور ذمہ داریوں کا کوہ گراں ہے جو مجھ پر یکا یک ٹوٹ پڑا ہے۔ میرے سامنے اب صرف ایک سوال تھا کہ ''اب کیا ہوگا؟'' والد محترم نے بڑے نازک حالات چھوڑے تھے اور اب ان نازک حالات سے مجھ کو عہدہ برآ ہونا تھا۔ ذہن دوڑتے دوڑتے خان بہادر سید احمد حسین رضوی ایم-ای-بی کا خیال آیا۔ تمباکو کے مشہور کارخانہ احمد حسین دل دار حسین کے مالک جو علاوہ آنریری مجسٹریٹ وغیرہ ہونے کے لکھنؤ کے مشہور روزنامہ ''ہمدم'' کے مشہور ڈائرکٹر بھی

تھے۔ صحافت کو اپنے قریب ترین دیکھ کر میں ''ہمدم'' کے عملہ میں شرکت کرنے کی خواہش لے کر خان بہادر کے پاس پہنچا۔ خان بہادر صاحب کچھ ننھیالی عزیز ہوتے تھے اور مجھ سے بڑی حد تک واقف بھی۔ میری اس خواہش کو سن کر انہوں نے مجھ سے صرف ایک ہی بات کہی کہ:

> ''میاں بڑی مشکل پسندی سے کام لے رہے ہو اخبار نویسی بڑے دل گردے کا کام ہے مگر میں تمہاری حوصلہ شکنی نہیں کرتا البتہ ''ہمدم'' میں جو جگہ دے سکتا ہوں وہ حاضر ہے۔ اب ترقیاں کرنا تمہارا کام ہے۔''

اور یہ کہہ کر سید جالب دہلوی کے نام ایک خط لکھ دیا جو روزنامہ ''ہمدم'' کے ایڈیٹر تھے۔ میں وہ خط لے کر ''ہمدم'' کے دفتر پہنچا اور سید جالب کے کمرے میں جا کر دم لیا۔

ترکی ٹوپی پہنے جس کا پھندنا آگے پڑا ہوا تھا اور پھندنے کے نیچے سفید بالوں کا گچھا ٹوپی سے پناہ مانگ کر نکلا بھاگتا تھا۔ پریشان سی سفید داڑھی ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں قلم، میز سے کچھ ہی اٹھا ہوا سر۔ اس سج دھج سے ایک بزرگ اس طرح لکھنے میں مصروف تھے گویا اونگھ رہے ہیں۔ میرے آنے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ لکھتے رہے نہ کچھ سوچنا نہ غور کرنا۔ بس لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ اتفاقاً کاتب کے آ جانے سے گردن اوپر اٹھی موقع دیکھ کر میں نے عرض کیا ''السلام علیکم'' نہایت کرخت آواز میں ''وعلیکم السلام'' کہا۔ میں نے خان بہادر صاحب کا خط چپکے سے دے دیا۔ پڑھ کر دزدیدہ نگاہوں سے پہلے تو دیکھا۔ اس کے بعد میرا شجرہ شروع کر دیا:

> ''آپ کے چچا صاحب قبلہ نے دہلی سے روزنامہ ''اخبار'' نکالا تھا۔ میں اس میں کام کر چکا ہوں۔ بلکہ وہ میرے ایک قسم کے استاد ہیں۔ آپ کے بڑے چچا لندن تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے پھر آپ تشریف ہی نہ لائے۔ آپ کے والد صاحب بھوپال میں تھے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

میں حیرت سے ان کا منہ دیکھ رہا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ ان کو

میرے ہی متعلق نہیں ہر ایک کے متعلق عام طور پر معلوم ہوا کرتا تھا کہ وہ کون ہے کیا ہے۔ اس کا خاندان کہاں سے متعلق ہے۔ اس کی دادی کے کتنی مرتبہ آپریشن ہوئے تھے۔ اس کی نانی کی موت کس مرض میں واقع ہوئی اور اس کے خالو کو کس جرم میں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ یہ مقدمہ کن کن عدالتوں میں رہا، کس کس وکیل نے کیا کیا جرح کی وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی باتیں ہم آپ سب سنا کرتے تھے مگر یاد نہیں رکھتے۔ میر صاحب کے دماغ سے نکلنے کے لیے پھڑ پھڑائے گی مگر میر صاحب کا دماغ یادداشت کا ایسا پنجرہ تھا جس میں کوئی صید ایک مرتبہ آ کر پھر کبھی رہا نہیں ہوا۔

مختصر یہ کہ ”ہمدم“ میں ملازم ہو گیا۔ میر صاحب نے رگیدنا شروع کر دیا۔ میرے سیاہ حروف کی عبارت پر ان کے سرخ رنگ کی اصلاح ہونے لگی۔ شروع شروع میں تو سیاہ عبارت تمام کی تمام قلم زد ہو جاتی تھی اور اس کی جگہ پر میر صاحب کی سرخ عبارت میری نالائقی پر خون کے آنسو بہاتی نظر آتی تھی۔ اس کے بعد سرخ سیاہ عبارت کا تناسب ایسا ہو گیا کہ قتل عام تو ہوا تھا مگر کچھ سخت جان بچ گئے ہیں غالباً سرکاری گواہ بن گئے تھے۔ رفتہ رفتہ خون کی ایک آدھ چھینٹ اور پھر خال خال سرخ رنگ کی چمک مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ کوئی چیز اصلاح کے بغیر رہ گئی ہو۔ ترجمہ ہو، مزاحیہ کالم ہو ہر جگہ اصلاح موجود ہے۔ اکثر تو اصلاح پر غصہ بھی آتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ ہمت کر کے لڑ بیٹھا۔ میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ ”نقطۂ نگاہ“ آپ نے اس کو کاٹ کر لکھ دیا ”زاویۂ نگاہ“ جلبلاتا ہوا وہ اصلاح لے کر میر صاحب کے پاس پہنچا:

آپ نے لفظ ”نقطۂ نگاہ“ کاٹ کر ”زاویۂ نگاہ“ بنا دیا ہے اس میں کیا فرق ہو گیا۔“

سر جھکائے ہوئے بولے:

> ”بہت بڑا فرق ہے دونوں میں نقطۂ نگاہ تیقن کے موقع پر استعمال ہوتا ہے گویا آپ کی نظر پورے وثوق کے ساتھ ایک خاص نقطہ پر ہے اور زاویۂ نگاہ میں شک کا احتمال باقی رہتا ہے۔ گویا نگاہ نے نقطہ تک پہنچنے کا ایک زاویہ تو بنا لیا ہے مگر ابھی وہ نقطہ دریافت نہیں کیا

> ہے۔ جس موقع پر آپ نے لکھا ہے وہاں زاویہ نگاہ زیادہ سجتا ہے۔ آپ نے لکھا کہ سائنس کمیشن کے متعلق ہمارا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ حکومت نے اپنے تدبر کے فقدان کا ایک اور ثبوت دیا ہے۔ اگر یہاں زاویہ نگاہ لکھ دیجیے تو آپ پر نتیجہ کی ذمہ داری نہیں رہتی اس لیے کہ بہت ممکن ہے کہ سائنس کمیشن کا مقصد اپنے نتیجہ پر پہنچ کر عین تدبر ثابت ہو اس وقت اگر زاویہ نگاہ غلط بھی ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے مگر نقطۂ نگاہ کا غلط ہونا ایک صحافی کی موت ہے۔"

اپنا سامنہ لے کر چلے آئے مختصر یہ کہ اسی قسم کی اصلاحوں کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔ میر صاحب کو زندہ انسائیکلو پیڈیا کہا جاتا تھا۔ آپ لاکھ اجنبی بن کر جائیں مگر جہاں آپ نے اپنا نام سنایا۔ آپ کے متعلق باقی حالات وہ آپ کو سنانا شروع کر دیں گے کہ آپ کے دادا اس سن میں ہجرت کر کے افغانستان کے راستے پشاور تشریف لائے، اتنے دن تک خشک میووں کی تجارت کی اور اس تجارت میں اتنا کمایا۔ پھر خشک میووں کی تجارت پر ایک سیر حاصل تقریر کریں گے۔ میووں کے باغات کو اگر موضوعِ سخن بنا لیا ہے تو سمجھاتے چلے جائیں گے کہ پالیز کس طرح بناتے ہیں اور ان میں کاریزوں کے ذریعہ پانی کس طرح پہنچاتے ہیں۔ ان زمین دوز نہروں کے پانی کا مزہ کیسا ہوتا ہے، ان کا پانی کس قسم کے امراض پیدا کرتا ہے اور ان امراض کے لیے کون کون سی دوائیں مفید ہیں۔ ان کا کیا علاج ہے۔ اگر آپ نے گھبرا کر ان کی توجہ خود ان ہی کے حقے کی طرف مبذول کروا دی کہ "سید صاحب حقہ جل بجھا ہے شاید" تو اب وہ حقے کے موضوع پر ایسی بحث کریں گے کہ حقہ کی تمام تاریخ آپ کے سامنے آجائے گی کہ کب یہ ایجاد ہوا۔ کن کن ممالک میں کس کس قسم کا حقہ پیا جاتا ہے۔ عظیم اللہ خانی حقہ کیا چیز ہے۔ پیچوان، گڑگڑی، ناریل، سٹک یہ سب کیا ہیں؟ لکھنؤ نے حقے کے معاملے میں کن تکلفات سے کام لیا ہے۔ ہر دم تازہ حقے کی کون سی قسم ہے۔

مختصر یہ اگر آپ اسی حقے پر ایک تھیسس لکھ دیں تو ڈاکٹریٹ کہیں نہیں گئی اور ایک حقے

پر کیا منحصر ہے۔ کسی موضوع پر بات کر لیجیے ان شاء اللہ بات کریں گے بات کی جڑ بتائیں گے اور بات کی پھننگی تک بات کرتے چلے جائیں گے۔ مثلاً چھیڑ دیجیے حلوہ سوہن کا ذکر، بس وہ شروع ہو جائیں گے۔ کہ جی ہاں خوب ہوتا ہے حلوہ سوہن، مگر در اصل یہ مٹھائی نہیں ہے بلکہ حکما نے امرا کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں گھی کھانے کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا اور تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حلوہ سوہن سب سے پہلے نانا فرنویس کے لیے اس کے طبیب ہندی عبدالستار سرہندی نے بتایا تھا مگر وہ اس کو ترقی نہ دے سکے اور یہ نسخہ صرف بیاض سرہندی میں رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ حکیم الحکما میر فضل اللہ سبزواری نے اس نسخے کو حاصل کیا اور کئی امرا پر آزمایا اور دماغ کی خشکی اور نیند کی کمی کے لیے یہ بہترین نسخہ ثابت ہوا۔ پھر اس میں ترمیمیں کی گئیں اور آخری صورت یہ ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح کی ایک چیز بنائی جاتی تھی جس کے سوراخوں میں گھی ہوتا تھا اس میں ایسے اجزا بھی ہوتے تھے کہ یہ گھی نقصان نہ پہنچا سکے اور معدہ اس کو قبول کرے۔ سینہ بہ سینہ یہ نسخہ دلی کے رحمت علی حلوائی تک پہنچا اور اس کے خاندان نے حلوہ سوہن کو اتنی ترقی دی کہ ملکہ وکٹوریہ اس ہندوستانی تحفے کو کرسمس کا بہترین تحفہ کہا کرتی تھیں۔ غرض تو کیا حقہ کیا حلوہ سوہن، ان کو تو اپنی معلومات کے اظہار کے لیے ایک موضوع چاہیے ہوتا تھا۔ وہ حقہ نہ سہی حلوہ سوہن سہی۔ حلوہ سوہن نہ سہی اجنتا کے غار سہی۔ جو موضوع چھڑ جائے جالب صاحب اس پر گھنٹوں بول سکتے تھے۔ خواہ وہ جنگ بلقان کے متعلق ہو یا سائمن کمیشن سے متعلق وہ زر دوزی کا قصہ ہو یا نقب زنی کا۔ ان کو اپنی معلومات کے خزانے لٹانے سے مطلب، افیون سے شوق فرماتے تھے اور اپنی پرانی کتابیں جمع کرنے کے افیون سے زیادہ رسیا تھے۔ دعوتوں میں شرکت عبادت کی طرح فرض سمجھتے تھے اور یہ حق اسٹاف کے کسی ممبر کو کبھی نہ دیتے تھے۔ روزنامہ ''ہمدم'' ہی کے زمانے میں بڑے بڑے شاگرد پیدا کیے سیاست والے سید حبیب، چودھری رحیم علی ہاشمی، قاضی محمد حامد حسرت، انیس احمد عباسی اور نہ جانے کون کون، نام تھا بشارت علی مگر مشہور ہوئے جالب دہلوی کے نام سے، یہ نہ پتا چل سکا کہ جالب صاحب نے اپنے اس تخلص سے بھی کبھی کام لیا یا نہیں۔ بہر حال

جالب صاحب ''ہمدم'' سے دست بردار ہو کر اپنے ذاتی اخبار روزنامہ ''ہمت'' کے مالک اور مدیر بن گئے مگر وقت پورا ہو چکا تھا۔ عمر نے وفا نہ کی۔

''ہمدم'' میں میرا تقرر چالیس روپیہ ماہوار مشاہرہ پر ہوا تھا۔ ڈیوٹی رات کی مقرر کی گئی تھی۔ میں ہر موسم اور قسم کے حالات میں رات کو بارہ بجے چار میل کا فاصلہ سائیکل پر طے کر کے دفتر پہنچ کرتا تھا اور صبح آٹھ بجے گھر واپس آیا کرتا تھا اس معمول میں نہ ساون بھادوں کی بارشیں کوئی فرق پیدا ہونے دیتی تھیں نہ دسمبر جنوری کے جاڑے، راستہ میں جابجا کتوں کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا پڑتی تھی اور کبھی کبھی ان سے زیادہ پولس والے کو سمجھانا پڑتا تھا کہ میں امن پسند شہری ہوں اور چوری کرنے نہیں نکلا ہوں۔ بلکہ قلم سے کنواں کھودنے جا رہا ہوں تاکہ اپنے حصے کا پانی پی سکوں۔ ایک رات ایک نہایت کج خلق کتے نے میرا چسٹر کھینچ کر مجھ کو سائیکل سے گرا لیا مگر معلوم ہوا کہ اس کو میری ضرورت نہ تھی بلکہ میرے چسٹر کے صرف ایک دامن کی ضرورت تھی، جسے وہ نوچ کر لے جا چکا تھا۔ وہ تو کہیے کہ والد صاحب کے ترکہ میں مجھ کو ایک چسٹر بھی مل گیا تھا وہ کام آ گیا ورنہ اس قیامت کی سردی میں بغیر چسٹر مجھ کو یہ سفر طے کرنا پڑتا۔ غالباً یہ میری اسی صبر آزمائی کا نتیجہ تھا کہ جس وقت سید جالب صاحب دہلوی روزنامہ ''ہمدم'' کی ادارت سے مستعفی ہو کر جا رہے تھے، میری چالیس روپیہ ماہوار سے شروع ہونے والی تنخواہ پونے دو سو تک پہنچ چکی تھی اور اس زمانہ کی تنخواہوں میں نہایت معقول تنخواہ سمجھی جاتی تھی۔ سید صاحب نے اپنی علاحدگی کے بعد خان بہادر سید احمد رضوی کو جو خط لکھا تھا اس میں سفارش بھی کی تھی کہ میں اپنی قائم مقامی کے لیے شوکت کو چارج دے رہا ہوں مگر خان بہادر صاحب سے میری دور کی رشتہ داری میری نہایت قریبی حق تلفی بن گئی اور انہوں نے خویش پروری کے ڈر سے یہی جواب دیا کہ ملک نصر اللہ خان عزیز سابق ایڈیٹر کا تقرر ہو چکا ہے آپ چارج براہ راست انہیں کو دیں اور پھر مجھ کو سید کا وہ خط دکھا کر بھی کہہ دیا: کہ تعلقہ داران اودھ کے جھگڑے میں تم کو پھنسانا اور خود اپنے سر خویش پروری کا الزام نہ لینے کے لیے میں نے تمہارا چارج لینا مناسب نہیں سمجھا۔

سید صاحب کی الوداعی پارٹی کے ساتھ ایک گروپ فوٹو لینے کا اہتمام تھا۔ سید صاحب حسب معمول اس تصویر کے لیے بھی شیروانی کا کالر اور پہلا بٹن بند کر کے باقی تمام شیروانی کھلی چھوڑ کر جوتے کی ڈوریاں باندھے بغیر جب چلے تو ہم نے ان سے کہا کہ:

''میر صاحب تصویر کے لیے تو بٹن لگا لیجیے شیروانی کے اور جوتے کی ڈوریاں باندھ لیجیے۔''

میر صاحب کے صاحب زادے عشرت صاحب نے بغیر سوچے سمجھے فرمایا:

''حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلآرام را''

سید صاحب نے بڑی متانت سے فرمایا:

''شوکت صاحب سن لیا آپ نے میں اپنے صاحب زادے کا دل آرام ہوں۔ اس آرام پر جو میری شکل کا ہو۔ ہمارے عشرت میاں کے ذہن میں کسی شعر یا کسی مصرع کا محفوظ رہ جانا بے حد خطرناک ہوتا ہے کہ خدا جانے یہ کب اس کو کسی پر دے ماریں۔''

افسوس کہ سید صاحب کی کوئی تصویر میرے پاس محفوظ نہیں ہے ورنہ اس ''روئے دل آرام'' کی جھلک دکھائی جا سکتی۔

(۲)

سید جالب تو ''ہمدم'' سے چلے گئے مگر میرے لیے ایک ایسی مصیبت چھوڑ گئے جو طول کھینچتے کھینچتے شیطان کی آنت بن گئی۔ مولانا سیماب اکبر آبادی اور سید جالب کے درمیان کچھ ان بن سی ہو گئی تھی اور اس فساد کی جڑ وہ نظمیں تھیں جو رسالہ ''پیمانہ'' میں ساغر نظامی صاحب کے نام سے نکلتی رہتی تھی، جن میں سید جالب ہی کو نہیں بلکہ اکثر بزرگوں کو شدید اعتراض تھا کہ ادب کے نام سے یہ کیا ''بے ادبی'' رواج پا رہی ہے۔ وہ نظمیں تھیں بھی واقعی کچھ حد سے گزرتی ہوئی۔ مثلاً دو ہی نظموں کے چند اشعار ذہن میں رہ گئے ہیں جن سے تھوڑا بہت اندازہ تو ہو ہی

جائے گا ایک نظم جس کا عنوان ''امرود'' تھا اس قسم کے اشعار پر مشتمل تھی:

لوگو! بہارِ میوۂ مقصود دیکھنا
کافر ثمر فروش کے امرود دیکھنا
امرود کے گھلاؤ میں کتنا گداز ہے
شاید شبابِ سینہ سے کچھ سازباز ہے
تیری طرف جو دستِ تمنا دراز ہے
نیرنگیٔ شباب کی تصویرِ ناز ہے
اس ٹوکری سے گوہرِ مقصود پھینک دیں
ہنس کر مری طرف بھی ایک امرود پھینک دیں
امرود پر ہیں سرخ حنا رنگ چتیاں
ہر داغ سرخ پر لبِ لعلیں کا ہے گماں
گویا کہ چلمنوں میں جدا کر کے ساریاں
بیٹھی ہوئی ہیں سینکڑوں دوشیزہ لڑکیاں

اس طرح ''پان'' کے زیرِ عنوان ایک نظم شائع ہوئی تھی اس میں حسبِ معمول اسی قسم کے اشعار تھے کہ:

کثرتِ رنگ و لطافت سے جو ہو یاقوت
وہ زباں ہونٹوں میں رکھ لینے کے قابل کیوں نہ ہو
اٹھو اک پان اپنے دستِ ناز پیرا سے بناؤ
اور تمہاری انگھڑیوں میں کیف کے سامان بھی

اس قسم کے نظموں پر عصمتِ ادب کے محافظ بزرگ کیوں کر خاموش بیٹھتے۔ نتیجہ یہ کہ دوسرے معترضین کے علاوہ سید جالب دہلوی نے ''ہمدم'' میں ''ادب کے نام پر فحاشی'' کے

زیرعنوان ایک اداریہ لکھ دیا۔ لکھنؤ کا مشہور مزاحیہ اخبار ''اودھ پنچ'' تو ہاتھ جھاڑ کر سیماب، ساغر اور ''پیمانہ'' کے پیچھے پڑا ہی ہوا تھا اور ''پیمانہ'' کی نثر اور نظم دونوں کا مسلسل مذاق اڑا رہا تھا۔ اس کی نثر کی تحریفوں پر تحریفیں شائع کر رہا تھا کہ:

''لپاڈ گدیت تاگارناہ کے غمزدہ ہائے متعفن''

''سٹڈ اس فطرت کی روح اندوزی سوری''

دغیرہ وغیرہ مگر سید جالب دہلوی کے اس اداریہ نے اس مذاق کو سنجیدہ کروٹ دے دی اور مولانا سیماب کے قصر الادب میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔ اس زمانہ میں ''قصر الادب'' سے علاوہ ''پیمانہ'' کے ایک ہفتہ وار اخبار ''تاج'' بھی نکلا کرتا تھا۔ مولانا نے اس میں سید جالب کے متعلق ایک ایسا مضمون لکھا جس میں وہ بجائے ادبی بحث کے ذاتیات پر اتر آئے اور سید جالب کی افیون نوشی پر بحث کرتے ہوئے یہاں تک لکھ گئے کہ:

''یہ افیونی اپنی پینک سے اس وقت چونکا ہے جب زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے اور یہ اب تک اعتبارات کی لکیر پیٹ رہا ہے۔''

اس مضمون کو دیکھ کر غصہ تو بہت آیا، مگر مصیبت یہ تھی کہ یہ جھگڑا تھا دو بزرگوں کے درمیان۔ مولانا سیماب بھی میرے بزرگ تھے اور سید جالب بھی، فرق یہ تھا کہ سید جالب علاوہ بزرگ ہونے کے استاد بھی تھے۔ میں تو شاید پھر بھی چپ ہی رہتا مگر سید صاحب نے مجھ کو طلب فرمایا اور یہ مضمون دکھا کر ارشاد فرمایا:

''آپ کے مزاحیہ کالم کے لیے سیماب صاحب نے بڑا مواد فراہم کر دیا ہے۔ بحث اب آپ کے اور ان کے درمیان ہوگی۔''

ان ہی دنوں ''پیمانہ'' میں ''ہندوستان کا شاعرِ اعظم'' کے زیرعنوان ساغر صاحب کا ایک مضمون سیماب صاحب کے متعلق نکل رہا تھا جس میں اور تو بہت سی عجیب و غریب باتیں تھیں ہی مثلاً علامہ اقبال کے مقابلہ پر علامہ سیماب کی جوڑ وغیرہ وغیرہ مگر ''ہمدم'' کی دو دو باتیں اسی مسلسل مضمون سے مولانا سیماب کی پیدائش کا قصہ لے اڑیں جو ساغر صاحب کے الفاظ میں یہ تھا کہ:

> ''مرمری گنبد تاج پر بیٹھے ہوئے سفید کبوتر کے بازوؤں میں آفتاب کی پہلی کرن نے سرخ آئینے تیار کیے۔ سرزمین اکبرآباد کو شاعر اعظم کے جلوؤں نے منور کردیا۔''

میں نے ''ہمدم'' کے باتونی کی حیثیت سے اس پر سخت حیرت واستعجاب کا اظہار کیا کہ ایک انسان کی پیدائش میں کسی کبوتر کا کیسا دخل ہوسکتا اگر مولانا کے شاگرد رشید کو اپنے محترم استاد کی عظمت کا ایسا ہی خیال تھا تو اس قسم کی باتیں لکھتے کہ عین اس وقت جب آفتاب طلوع ہورہا تھا سرزمین اکبرآباد کے لیے بھی سیماب نام کا ایک آفتاب طلوع ہوا مگر یہ کبوتر کہاں سے آگیا اور اس نے اس پیدائش کو کیوں بلاوجہ ''غترغوں'' بناکر رکھ دیا ہے۔ اس کالم کا نکلنا تھا کہ ہفت روزہ ''تاج'' کے اگلے ہی نمبر میں سیماب صاحب کا ایک قطعہ آگیا کہ:

ادب باقی ہے اب نہ ان میں استعداد باقی ہے
فقط طاغوتیوں کی فکر مادرزاد باقی ہے
کوئی ''ہمدم'' کے ''باتونی'' سے جا کر صرف یہ کہہ دے
کہ شیطاں مر گیا اس کی مگر اولاد باقی ہے

اب کیا تھا گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی ''ہمدم'' میں روزانہ ''دو دو باتیں'' اسی موضوع کے لیے وقف ہوگئیں۔ ''تاج'' ہفتہ میں ایک بار جلی کٹی سناتا رہا۔ یہ سلسلہ پورے ایک سال جاری رہا یہاں تک کہ خان بہادر سید حسین رضوی نے مجھ کو طلب کیا اور فرمایا کہ خدا کے واسطے اب اس سلسلہ کو ختم کرو حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ میں نے عرض کیا کہ کسی مناسب موقع پر اس سلسلہ کو ختم کردیا جائے گا۔ مگر انہوں نے قطعی حکم دیا تھا کہ مناسب موقع آپ کو خدا جانے کب ملے آپ فوراً یہ سلسلہ ختم کردیں۔ اب میں سخت شش وپنج میں مبتلا ہوگیا کہ ایک دم سے یہ سلسلہ کیوں کر ختم کیا جائے کہ اسی دن کی ڈاک سے ''تاج'' کا تازہ پرچہ ملا جس میں مولانا سیماب کی تازہ غزل شائع ہوئی تھی کہ:

میت نہ مری جا کر ویرانے میں رکھ دینا

اس غزل پر حسب معمول تنقید کی گئی اور مقطع سے بھرپور فائدہ اٹھا کر اسی مقطع کو اس

طویل سلسلہ میں مقطع بنادیا۔ مولانا کا مقطع تھا:

سیماب حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے
جذبات کی اک بجلی پروانے میں رکھ دینا

میں نے ''دو دو باتوں'' میں لکھا کہ ''ہم کو شروع ہی سے یہ انتظار تھا کہ مولانا سیماب ایک مرتبہ بھی اپنی خامیوں کا اعتراف کرلیں تو ہم یہ سلسلہ ختم کریں۔ شکر ہے کہ آج انہوں نے اعتراف کرلیا ہے کہ:

سیماب حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے

لہٰذا اس اعتراف کے بعد ہم اس سلسلہ کو ختم کررہے ہیں۔

یہ سلسلہ یوں تو ختم ہوگیا مگر مدتوں یہ حال رہا کہ جب کبھی اس خواہ مخواہ کی جنگ کا خیال آتا تھا دل ایک عجیب قسم کی ندامت سی محسوس کرتا تھا کہ میں ایک بزرگ کی شان میں کس قدر گستاخیاں کرچکا ہوں اور اس جرم کی سزا مولانا سیماب نے بھی ایسی دی کہ میں شاید زندگی بھر نہ بھول سکوں گا کہ دو سال کے بعد علی گڑھ کے ایک مشاعرہ میں جب وہ اچانک میرے سامنے آگئے تو قبل اس کے کہ میں سر پر پیر رکھ کر بھاگوں انہوں نے مجھ کو نہایت گرم جوشی سے گلے لگاتے ہوئے کہا:

''شوکت صاحب! میں آپ کو ناراض نہ رہنے دوں گا۔ اگر اس قسم کی تلخیاں نہ ہوں تو زندگی کی شیرینی عذاب بن جائے۔''

مولانا کے اس ایک ہی فقرے نے ذہن سے نہ جانے کتنا بوجھ اتار دیا۔ کاش ایسے ہی فیاض بزرگ ہر زمانہ بھی پیدا کرسکتا۔

روزنامہ ''ہمدم'' سے ابھی میں وابستہ ہی تھا کہ میرے دوست نسیم انہونوی صاحب ایڈیٹر رسالہ ''انکشاف'' اور امین سلونوی صاحب ایک روز ایک عجیب منصوبہ بنا کر میرے پاس آئے کہ ہم ایک تثلیث قائم کرنا چاہتے ہیں۔ عرض کیا کہ نئی کیوں قائم کررہے ہو۔ ایسا ہی تثلیث پرستی کا شوق ہے تو ہم سے لے لو یہ تثلیث تو مدت سے قائم ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ دونوں

صاحبان ایک مزاحیہ ہفتہ وار اخبار نکالنے کے دھن میں مبتلا ہیں بشرطیکہ میں بھی تیار ہو جاؤں۔ مجھ کو ان دونوں نے بڑے محکم دلائل کے ساتھ یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ "اودھ پنچ" کا "دورِ جدید" بھی نزع کے عالم میں ہے اور حکیم ممتاز حسن صاحب "ہمت" ہار چکے ہیں۔ گنڈے دار تو پہلے ہی سے نکل رہا ہے مگر شاید بالکل ہی نہ نکلے۔ ان حالات میں ہم اگر ایک مزاحیہ اخبار جاری کر دیں تو اس کا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ امین سلونوی نے اس کا نام "لکھنؤ پنچ" تجویز کیا۔ نسیم انہونوی نے کئی نام تجویز کیے جن میں سے ایک "مہا پنچ" بھی تھا۔ میں نے رائے دی کہ اگر پنچ کو بہت ہی پنچ بنانا ہو تو "سرپنچ" کیوں نہ رکھا جائے اس کا نام۔ یہ نام اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔ ہم تینوں میں اگر سچ پوچھیے تو عملی ادبی نہ صرف نسیم صاحب نے "سرپنچ" کے اجرا کے انتظامات نہایت انہماک سے شروع کر دیے۔ دفتر کرایہ پر لیا گیا۔ اس میں تھوڑا بہت فرنیچر آراستہ کیا گیا۔ کاتبوں کا انتظام کیا گیا۔ پریس سے معاملات طے کیے گئے دفتری ایسا ڈھونڈا گیا جو دفتری کا دفتری ہو چپراسی کا چپراسی ہو۔ میرے سپرد صرف یہ کام تھا کہ میں "ہمدم" کے دفتر سے واپسی پر اس دفتر میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کر مضمون نگاروں کو مضامین کی فراہمی کے لیے خطوط لکھا کروں۔ امین سلونوی صاحب کے سپرد یہ مہم تھی کہ وہ کہیں نہ کہیں سے ایک کارٹونسٹ پیدا کر لائیں۔ چنانچہ وہ روز ایک کارٹون لے آیا کرتے تھے کہ آپ لوگ اس کی شکل و صورت پر نہ جائیں۔ اس کی تعلیمی کم مائیگی کو نہ دیکھیں۔ اس کی بے وقوفی پر غور نہ کریں۔ یہ اگر مشق کرتا رہا تو خدا کی ذات سے امید ہے کہ اچھا کارٹونسٹ ثابت ہوگا۔ یہ ایک سائن بورڈ بنانے والے کے یہاں وارنش کرتا ہے۔ کبھی کسی قلعی گر کو پکڑ لاتے کہ ہے تو یہ قلعی گر مگر اس سے میں نے وعدہ لیا ہے کہ یہ کارٹون بنانے کی مشق آج ہی سے شروع کر دے گا۔ آخر ایک دن وہ فرنگی محل کے علما میں ایک متبرک عالم دین و مفتی شرح متین کے صاحب زادے کو لے آئے کہ پنچ صاحب کو آخر کارٹونسٹ مل ہی گیا۔

اس مرشد زادے کا نام تھا کامل اور انہوں نے خود ہی نہایت سنجیدگی سے اپنے کارٹونسٹ ہونے کا اعلان کیا تو میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ گول میز کانفرنس کا ایک خاکہ

بنائیں جس سے یہ مفہوم پیدا ہو کہ اس سے کچھ ہونے والا نہیں ہے اور یہ ایک بے نتیجہ کوشش ہے۔ کامل صاحب نے بیٹھے بیٹھے ایک بڑا سا انڈا بنادیا جس پر چند مرغیاں بٹھائیں۔ کسی مرغی پر گاندھی جی کا سر تھا کسی پر پنڈت مالوی کا کسی پر مولانا شوکت علی کا۔ اسی طرح چند اور رہنماؤں کے سر والی مرغیاں اس اندے پر بٹھادیں مگر یہ انڈا نیچے سے ٹوٹا ہوا تھا۔

میں نے اس کارٹون کو دیکھتے ہی کامل صاحب سے کامل معاملات طے کرنے کے لیے نسیم صاحب سے کہہ دیا اور امین سلونوی صاحب کو ان کی اس مہم میں کامیابی پر مبارک باد دی کہ آخر کار جھک مارتے مارتے آپ پالا مارنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ ادھر یہ تمام انتظامات مکمل ہو رہے تھے۔ ادھر میرے لکھے ہوئے خطوط کے جواب میں مضامین آنا شروع ہو چکے تھے مگر نسیم انہونوی صاحب کہہ چکے تھے جب تک چھ نمبر آپ مرتب کر کے رکھ نہ دیں گے اس وقت تک ''سرپنچ'' کا پہلا نمبر نکالا نہ جائے گا۔ مجھ کو سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ مزاحیہ اخبار نکال جا رہا ہے تو معیار سے گرا ہوا نہ ہو اور مذاق بداخلاقی نہ بن جائے۔ جن مزاح نگاروں کو میں نے خطوط لکھے تھے ان میں سے پطرس، رشید احمد صدیقی، چراغ حسن حسرت، مولانا عبدالمجید سالک وغیرہ نے تو خط کا جواب ہی نہ دیا۔ البتہ سب سے پہلا جواب مرزا عظیم بیگ چغتائی کا مع ایک تازہ مضمون کے آ گیا۔ پھر مرزا فرحت اللہ بیگ اور میاں ایم- اسلم کے جوابات مع مضامین کے آئے اور اس کے بعد ایک سلسلہ قائم ہو گیا کہ کسی ڈاک میں حضرت خواجہ حسن نظامی کا تبرک آ گیا تو کسی ڈاک سے غمگین کاظمی صاحب کا مضمون، مولانا ابن الحسن فکر، مرزا محمد عسکری، حضرت ظریف لکھنوی، احمق پھپھوندوی، چودھری محمد علی ردولوی اور بہت سے دوسرے بزرگوں نے بڑی ہمت افزائی کی۔ مولانا تاجور نجیب آبادی نے ''اے تازہ واردان بساط ہوائے دل'' کے زیر عنوان نہایت عبرت انگیز مزاحیہ مضمون بھیجا اور بزرگ محترم سلطان حیدر جوش اور جناب فلک پیما نے تو قطعاً غیر متوقع طور پر اپنے مضامین بھیج کر میرے حوصلے کہیں سے کہیں پہنچا دیے۔ ملا رموزی صاحب نے بھی ''سرپنچ'' نوازی میں بڑی فیاضی سے کام لیا۔

امین سلونوی صاحب اس دھن میں لگے ہوئے تھے کہ نئے مزاح نگار پیدا کرو،

چنانچہ یہ محکمہ انہوں نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا اور نہ جانے کتنے ایسے مزاحیہ مضامین حاصل کر چکے تھے جن کو پڑھ کر دھاڑیں مار مار کر ہنسنے اور کھلکھلا کھلکھلا کر رونے کو جی چاہتا تھا۔ آخر یہ مضامین ان ہی کے سپرد کر دیے تھے کہ وہ ان کا پرچہ ترکیب استعمال بھی بنائیں کہ ان مضامین میں قاری کو کہاں کہاں ہنسنا اور کہاں کہاں مسکرانا چاہیے تاکہ قاری رونا نہ شروع کر دے۔ آخر ''سرپنچ'' کا پہلا نمبر بڑی آب و تاب سے شروع کیا گیا اور امید سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ اخباری برادری نے بڑے اچھے تبصرے کیے اور اکابر اہل قلم نے بڑی حوصلہ افزائیاں کیں۔ اب مرحلہ یہ درپیش تھا کہ جو معیار اس پہلے نمبر نے قائم کیا تھا وہ قائم رہے اور بلندی سے پستی کی طرف اترنا نہ پڑے۔ اس زمانے میں ''ہمدم'' ایک عجیب بحران میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ملک نصر اللہ خان عزیز سے ''ہمدم'' کے ڈائرکٹروں کی نبھ نہ سکی۔ خان بہادر احمد حسین رضوی نے مینجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے استعفیٰ دے دیا۔

چودھری خلیق الزماں صاحب نگراں مقرر ہوئے مگر وہ بھی زیادہ وقت نہ دے سکے۔ مشہور کانگریسی کارکن گوپی ناتھ منتظم ہوئے اور چودھری رحم علی الہاشمی نے ادارت سنبھالی۔ اس ہڑبونگ میں میرے لیے یہی چارہ کار رہ گیا کہ میں چپکے سے کھسک جاؤں۔ نسیم انہونوی اور امین سلونوی بہت خوش تھے کہ میں اب پورا وقت ''سرپنچ'' کو دے سکوں گا مگر میں نے اپنا بار ''سرپنچ'' پر ڈالنا مناسب نہیں سمجھا اور منشی نول کشور کے اخبار ''اودھ اخبار'' کی ادارت سنبھالی۔ ''سرپنچ'' کا کام بدستور جاری رہا اور اب ''سرپنچ'' نے اپنے لیے اہل قلم کا ایک ایسا حلقہ حاصل کر لیا تھا کہ سچ پوچھیے تو انہیں کے بے لوث اور بے ساختہ تعاون سے ''سرپنچ'' دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔

نسیم انہونوی خالص کاروباری قسم کے آدمی تھے ان کے حسن انتظام نے ''سرپنچ'' کی بنیادیں نہایت مستحکم کر دیں۔ اس کے نہایت مہتم بالشان سالنامے اور دوسرے خاص نمبر بھی نکلنے لگے جو بے حد مقبول ہوئے۔ امین سلونوی صاحب نے مزاح نگار پیدا کرنے کی کُلی مہم جاری کیے رہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی اس مہم میں کامیاب بھی رہے اور شکر ہے کہ اب ان کو صرف ان ہی

مضامین پر ہنسی آتی تھی جن سے واقعی انبساطی پہلو نکلتا تھا ورنہ پہلے تو وہ اعتقاداً ہنس دیا کرتے تھے چوں کہ مضمون نگار نے یہ مضمون مزاحیہ سمجھ کر لکھ دیا ہے لہٰذا اس پر ہنسنا اخلاقی فرض ہے۔

(۷)

"اودھ اخبار" صحافت کے بام آدم کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی ادارت مل جانے میں اپنی صحافتی معراج سمجھ رہا تھا اس لیے کہ اسی کرسی پر ایسے نام ور لوگ رہ چکے تھے جن کے ڈنکے ہمارے ادب میں آج تک پٹے ہوئے تھے مگر "اودھ اخبار" کا قلم دان ادارت سنبھالنے کے بعد پتہ چلا کہ اب روز نامہ عجوبہ روزگار بن چکا ہے نہ مطبع نول کشور کے مالکوں کو اس سے کوئی بحث ہے کہ اس کی اشاعت کیا ہے۔ نہ اس سے کوئی بحث ہے کہ یہ کتنے نقصان میں چل رہا ہے۔ وہ تو بس اس کو نول کشور آنجہانی کی یادگار کے طور پر نکالے جا رہے ہیں نہ ان کی کہیں کوئی ایجنسی تھی نہ خود لکھنؤ کے کسی بازار میں فروخت ہوتا تھا بس چار پانچ سو پرچے وضع داری کے طور پر چھاپے جاتے تھے اور نہ جانے کہاں چھپا دیے جاتے تھے۔ نہ اس کے کسی شہر، قصبہ یا گاؤں میں نامہ نگار تھے نہ کسی اور ہی ذریعے سے خبریں فراہم ہوتی تھیں۔ ہوتا صرف یہ تھا کہ صبح تڑکے لکھنؤ میں شائع ہونے والے انگریزی اخبارات آجاتے تھے اور ان کی تھوڑی بہت خبریں الٹا سیدھا ترجمہ کر کے نہایت شان دار کتابت کے ساتھ شائع کر دی جاتی تھیں۔ چند مراسلہ نگار جن کے مراسلے دوسرے اخبار شائع نہ کرتے تھے اپنے مراسلے بھیج دیا کرتے تھے۔ ایک ایڈیٹر ہوتا تھا اور دوسرا اس کا نائب یہ دونوں مل کر پہلے تو خبروں کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ایڈیٹر صاحب اداریہ لکھنے بیٹھ جاتے تھے اور نائب صاحب قینچی ہاتھ میں لے کر ڈاک میں آئے ہوئے تبادلے کے اخبار کی قطع و برید شروع کر دیتے تھے لیکن اگر سچ پوچھیے تو اس سارے عملہ میں کام کے صرف ایک ہی بزرگ تھے جو اپنے منصب کے اعتبار سے کاتب تھے مگر ہر مرض کی دوا۔

اسم مبارک تھا منشی بنواری لعل اور تخلص تھا شوخ، کتابت اور شاعری تو خیر یہ کرتے ہی

تھے مگر اکثر یہ بھی ہوتا کہ مثلاً ایڈیٹر صاحب کی طبیعت موزوں نہیں ہے یا وہ اپنے نائب کے ساتھ تاش کھیل رہے ہوتے منشی بنواری لعل شوخ ہی ایڈیٹوریل بھی لکھ دیا کرتے تھے اور اس ایڈیٹوریل کا کوئی جداگانہ مسودہ نہ ہوتا تھا بلکہ وہ براہ راست کتابت ہی کرتے جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ اس دفتر میں اگر کسی کا دبدبہ تھا تو منشی بنواری لعل شوخ کا جو نہ ایڈیٹر کو خاطر میں لاتے تھے نہ اسسٹنٹ ایڈیٹر کو بلکہ ان کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ ایڈیٹر صاحب کے لکھے ہوئے اداریہ میں جہاں چاہیں اصلاح کردیں اور ایڈیٹر کو بتادیں کہ یہ بات تم نے غلط لکھی تھی جس کو میں نے صحیح کردیا ہے اور یہ سن کر ایڈیٹر کو صرف مسکرانا پڑتا تھا ورنہ منشی بنواری لعل شوخ اس کو آٹھ آٹھ آنسو رلانا بھی جانتے تھے۔

ادارت کا چارج لینے کے بعد جب یہ حالات میں نے دیکھے اور جب یہ کیفیات میں نے سنی تو میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ میں کہاں آ پھنسا ہوں اور ان حالات میں مجھ سے کیوں کر کام ہو سکے گا۔ منشی پریم چند آنجہانی مشہور افسانہ نگار ان دنوں مطبع نول کشور کے شعبۂ تصنیف و تالیف کے انچارج تھے اور اودھ اخبار کی تھوڑی بہت نگرانی بھی ان کے سپرد تھی۔ میں نے ان حالات کی تفصیل ان کو بتا کر ان سے مشورہ کیا کہ اس طرح میں یہاں کیوں کر کام کر سکوں گا تو وہ سب کچھ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے:

> ”تو گویا آپ یہاں کام کرنے آئے ہیں۔ بھائی صاحب یہ تنخواہ نہیں وظیفہ بلکہ وثیقہ ہے اور یہ کام نہ کرنے کے معاوضے میں دیا جاتا ہے۔ آپ اگر یہ سمجھے ہیں کہ یہ اخبار نکلتا ہے تو یہ غلط ہے در اصل اس کی لوح پر منشی نول کشور کی جو تصویر گول دائرہ میں چھپی ہے یعنی اخبار کی لوح نہیں بلکہ نول کشور کی لوح مزار ہے۔ مالکان مطبع کا اعتقاد یہ ہے کہ اودھ اخبار کو بہر صورت جاری رہنا چاہیے اس لیے کہ اس مطبع کو فروغ حاصل ہوا ہے اور منشی نول کشور کو اس سے تعلق خاطر تھا۔ اس کے علاوہ اس اخبار کا کوئی مقصد نہیں۔“

میں نے منشی پریم چند سے یہ سن کر بڑی حیرت سے یہ کہا کہ اس بے مقصدی کا شکار آخر میں کیوں کر بن سکوں گا اور یہ حرام کی تنخواہ مجھے کیسے ہضم ہوگی تو انہوں نے بدستور خندہ پیشانی کے ساتھ کہا کہ:

> "اگر آپ کا ہاضمہ ایسا ہی کم زور ہے تو آپ اس کے لیے ایک اسکیم تیار کیجیے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ وہ اسکیم آپ کے ساتھ جا کر منشی بشن نرائن بھارگو کے سامنے پیش کر دوں گا اور جتنا سر کھپایا جا سکتا ہے، کھپا لوں گا۔"

منشی پریم چند کے اس وعدے کے ساتھ میں نے ایک مفصل اسکیم تیار کر لی کہ مجھ کو اتنا عملہ درکار ہے۔ میں اس طرح کی ایجنسیاں قائم کرنا چاہتا ہوں۔ شعبۂ اشتہارات کو اس طرح منظم کرنا چاہتا ہوں۔ بیرونی نامہ نگاروں کے علاوہ اتنے مقامی رپورٹر چاہتا ہوں۔ اخبار کی ترتیب، کتابت اور طباعت میں یہ انقلاب چاہتا ہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ منشی بنواری لعل شوخ کو یا بالکل ہی نہیں چاہتا یا صرف ایک کاتب کی حیثیت سے چاہتا ہوں جس کا اور کسی بات میں کوئی دخل نہ ہو سکے۔ منشی پریم چند نے پوری اسکیم نہایت غور سے سنی، منشی بنواری لعل والے حصہ میں یہ ترمیم کیا کہ ان کا نام نہ لکھو بلکہ یہ لکھو کہ دفتر کا نظم و ضبط صرف اسی صورت سے قائم رہ سکتا ہے کہ عملہ کے لیے ایڈیٹر کو اپنے عملہ کے تقرر اور برخاستگی کے کلی اختیارات حاصل ہوں۔ میں نے اس ترمیم کو اپنے اختیارات کے لیے اور بھی مستحکم سمجھ کر قبول کر لیا۔ چنان چہ منشی پریم چند کی معیت میں منشی بشن نرائن بھارگو مالک مطبع کے سامنے میری پیشی ہوئی۔ جہاں سب سے پہلے منشی پریم چند نے ایک نہایت سلجھی ہوئی تمہیدی تقریر کی۔ اس کے بعد میری اسکیم اس کے ساتھ پیش کر دی گئی۔ بدقسمتی سے اس وقت بھارگو صاحب ریس پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے اور ان کے ذہن میں گھوڑوں کا اصطبل کھلا ہوا تھا۔ انہوں نے اسکیم لے کر رکھ لی کہ میں اس پر غور کروں گا۔

میں نے منشی پریم چند کے مشورے سے منشی بنواری لعل شوخ سے نہایت روادارانہ

تعلقات قائم رکھے۔ یہاں تک کہ میرے فرائض میں بھی یہ شامل ہو گیا کہ روزانہ ان کی ایک تازہ غزل سنا کروں اور اس کی بے حد داد دیا کروں۔ ایک دن وہ ایک نہایت خوب صورت فریم میں ایک نہایت طویل فارسی کا قصیدہ لے آئے جو شاہ نادر شاہ والیٔ افغانستان کی شان میں تھا اور منشی بنواری لعل شوخ اسے جشن تخت نشینی کے موقع پر سفیر افغانستان مقیم دہلی کے توسل سے بھیجنا چاہتے تھے۔ نہایت لالہ شاہی فارسی تھے اس قصیدے کی ''بوئے کچوری...... می آید'' کا اس سے بڑا نمونہ میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا مگر جب منشی بنواری لعل شوخ نے وہ قصیدہ بھیج دیا تو کچھ ہی دن بعد ان کو ایک انشیورڈ پارسل موصول ہوا جس میں دربار افغانستان کی طرف سے ایک پروانہ خوش نودی تھا، ایک پارکر قلم اور ایک سونے کی گھڑی۔ اب کیا تھا اب تو یہ خود منشی بنواری لعل شوخ اس کے مستحق ہو گئے تھے کہ ان کی شان میں ہم سب قصیدے کہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ منشی بنواری لعل شوخ کی شاعری نے مجھ کو ایسا عاجز کر دیا کہ میں نے منشی پریم چند سے تقریباً دست بستہ نہایت گڑگڑا کر کہا کہ جب تک بہار گو صاحب اس اسکیم پر غور کر رہے ہیں کم سے کم مجھ کو منشی بنواری لعل شوخ کی شاعری سے تو نجات دلوا دیجیے۔ چنان چہ منشی پریم چند نے ''اودھ اخبار'' کے دفتر کا معائنہ کیا۔ اس وقت یہ احکام دے دیے کہ ایڈیٹر کا کمرہ میرے کمرے سے ملا ہوا ہونا چاہیے اور اس طرح میں منشی بنواری لعل شوخ کی دسترس سے نکل بھاگا۔

اب میں منشی پریم چند کے زیادہ سے زیادہ قریب پہنچ چکا تھا اتنا قریب کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہی بیٹھے پوچھ لیا کرتے تھے کہ کیوں بھئی شوکت صاحب! حضرت آدم کی اہلیہ کا کیا نام تھا؟ اور میں ان سے دریافت کر لیا کرتا تھا کہ ''رکشا بندھن کی تاریخ کیا ہے اور کبھی میرے کمرے میں آ کر اور کبھی مجھ کو اپنے پاس بلا کر بڑی تفصیل کے ساتھ اس قسم کی معلومات فراہم کر دیتے تھے۔ اسی زمانے میں رسالہ ''نیرنگ خیال'' کے مدیر حکیم حسن یوسف صاحب نے مجھ کو ایک خط لکھا کہ میرا ایک کام کر دو، منشی پریم چند سے ایک افسانہ لے کر میرے نام وی پی روانہ کر دو۔ چنان چہ مجھ کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ افسانے اور مضامین بھی وی

پی کیے جاتے ہیں۔ میں نے منشی پریم چند سے کہا تو وہ کچھ چپ سے ہو گئے اور بڑی دیر کے بعد کچھ عجیب شرمائے ہوئے انداز سے کہا کہ:

> ''میرے لیے یہ بڑا دشوار مرحلہ ہوتا ہے کہ مثلاً آپ کے ذریعہ سے فرمائش آئی ہو تو میں کیوں کر وی پی بھیجوں اور بھیجوں بھی تو کتنی رقم کا۔ بہر حال میں افسانہ لکھ لوں پھر دیکھا جائے گا۔''

اور دیکھا یہ گیا کہ بہت شرماتے ہوئے منشی پریم چند نے پچاس روپے کا وی پی بھیج دیا۔ گویا بڑی رعایت کے ساتھ پچاس روپے۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھ کو تو منشی پریم چند پر بہت ہی رشک آیا۔ ادبی رسائل سے مضامین کا معاوضہ لینے کی راہ منشی پریم چند نے مجھ کو سکھائی تھی مگر ایک افسانہ کا معاوضہ پچاس روپے دینے والے تو آج بھی شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔

وہ اسکیم جو میں نے منشی پریم چند کے ساتھ جا کر بھارگو صاحب کو دی تھی۔ اس کا چھ مہینہ بعد یہ پتا چلا کہ وہ بھارگو صاحب نے اپنے کسی قریبی دوست رائے بہادر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مصنف ہسٹری آف اردو لٹریچر کو غور کے لیے دے رکھی تھی۔ چنان چہ منشی پریم چند نے ایک دن مجھ کو یہ پیغام دیا کہ تم کو رام بابو سکسینہ نے طلب کیا ہے جو اصلاً ڈپٹی کلکٹر ہیں مگر آج کل حکومت صوبجات متحدہ کے محکمہ اطلاعات کے افسر اعلیٰ لگے ہوئے ہیں اور پھر ان کے متعلق مجھ کو چند موٹی موٹی باتیں سمجھا دیں کہ وہ آدمی نہایت علامہ قسم کے ہیں۔ چنان چہ تم پر فرض ہے کہ ان کو علامہ سمجھ لو اور ان کو یقین دلا دو کہ اگر انہوں نے اردو کا یہ تذکرہ انگریزی میں نہ لکھا ہوتا تو اردو یتیم خانہ میں داخل ہو جاتی گویا قلعہ معلیٰ کے بعد معلی القاب اردو کو نصیب ہوا اور آپ ہی کی ذات والا صفات ہے۔ میں اس قصیدہ خوانی کے لیے تیار ہو کر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی خدمت میں باریاب ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک گھومنے والی کرسی پر، اردوئے معلیٰ منہ میں پائپ لیے بیٹھی ہے۔ بظاہر بڑے تپاک سے ملے مگر اس تپاک میں بھی وہ آدمی کم رائے بہادر زیادہ تھے۔ انشاء پردازی کا غازہ ملے ہوئے ہوئے خالص ڈپٹی کلکٹر ثابت ہوتے رہے۔ اردو سے اتنی دلچسپی وہ ضرور لے رہے تھے کہ انگریزی انداز سے اردو بول رہے تھے اور تھوڑی

دیر کے بعد ان کی اردو ختم ہو جاتی تھی۔ مجھ سے انہوں نے اودھ اخبار کے متعلق صرف اتنا ہی کہا کہ اسکیم آپ کی بہت اچھی ہے مگر ذرا مہنگی ہے اور اس کے بعد خود ہی سوال کر لیا کہ آپ نے میری کتاب ''ہسٹری آف اردو لٹریچر'' پڑھی ہے؟ جس کے جواب میں، میں نے اپنا قصیدہ شروع کر دیا جو منشی پریم چند پہلے ہی میرے کانوں میں پھونک چکے تھے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نہایت غور سے قصیدہ سنتے رہے اور ان کے انداز سے یہ معلوم ہوا تھا کہ قصیدہ گو شاعر کو خلعتِ فاخرہ سے نوازنے ہی والے ہیں۔ چنانچہ قصیدہ ختم ہوتے ہی انہوں نے گھنٹی بجائی۔ یقیناً یہ گھنٹی خلعتِ فاخرہ طلب کرنے کے لیے بجائی گئی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی چپراسی داخل ہوا آپ نے حکم دیا:

''چائے لاؤ''

اور پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا میں اس کا دوسرا حصہ بھی تیار کر رہا ہوں جس میں اس وقت کے تمام ادیبوں اور شاعروں کا ذکر ہوگا۔ مگر مصروف اس قدر ہوں کہ وقت نہیں ملتا۔ مثلاً یہ گروپ دیکھیے میں نے جب اس گروپ کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں پہلے ہی یہ گروپ دیکھ چکا ہوں یہ پہلی گول میز کانفرنس کا گروپ تھا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اس تصویر میں ایک موہوم سے سایہ پر انگلی رکھ کر کہا:

''ان کو پہچانتے ہیں آپ؟''

میں بھلا اس بے خدوخال دھبہ کو کیا پہچانتا۔ ابھی اس کو دیکھ ہی رہا تھا کہ آپ نے فرمایا:

''یہ میں ہوں، دماغ کا عرق نکال کر آیا ہوں گول میز کانفرنس میں مگر وہ لوگ بھی کیا یاد کریں گے کہ کس مصیبت کو گول میز کانفرنس میں مدعو کر لیا تھا۔''

میں ان کی مرضی کے مطابق اس گروپ کو دیکھ کر اور ان سے مرعوب ہو گیا مگر بعد میں صرف یہی کہ آپ کی یہ سیاہی اور سرکاری ذمہ داریاں کاش آپ سے اردو کی حق تلفیاں نہ کرائیں آپ نے اس یتیم بچی کے سر پر ہاتھ رکھا ہے تو اس کو پروان بھی چڑھا دیجیے یہ سن کر

بسکٹ کی طشتری میری طرف کھسکاتے ہوئے کہا:

''یہ لیجیے نا۔''

ایک ہفتہ کے بعد منشی پریم چند نے مجھ کو چند کاغذات دیتے ہوئے کہا کہ تمہاری اسکیم بڑی حد تک منظور کر لی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کو خاص شیشہ میں اتار چکے ہو اور اب مجھ کو بتانا پڑا کہ اس عرصہ میں تین پیشیاں ہو چکی ہیں اور تین قصیدے میں سنا چکا ہوں۔ بہر حال میں اس کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ منشی بنواری لعل شوخ کے بجائے مجھ کو رام بابو سکسینہ کی دربارداریاں کرنا پڑ رہی ہیں اور ان کا یہ صلہ بھی مل گیا ہے کہ میری اسکیم بڑی حد تک منظور ہو گئی ہے۔

ابھی اس اسکیم پر عمل درآمد شروع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نول کشور اسٹیٹ مع روزنامہ ''اودھ اخبار'' کے کورٹ آٹ وارڈس میں چلی گئی اور سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ منشی پریم چند کچھ دن پہلے ہی بنارس جا چکے تھے۔ میرے لیے بھی اب ''اودھ اخبار'' میں رہنا ممکن نہ رہا۔

(۸)

روزنامہ ''ہمدم'' کا دور ہو یا روزنامہ ''اودھ اخبار'' کا۔ ہر دور میں علاوہ صحافتی انہماک کے ادبی دور میں لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا اور ''سرپنچ'' کو زیادہ سے زیادہ کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کی دھن بھی سوار رہی مگر میرے لیے خود میرا ہی ایک مزاحیہ مضمون ''سودیشی ریل'' اچھی خاصی مصیبت بن چکا تھا یہ مضمون میں نے ۱۹۳۰ء میں رسالہ ''نیرنگ خیال'' لاہور کے سالنامے کے لیے لکھا تھا۔ جہاں سے وہ نہ جانے کتنے دوسرے رسائل میں نقل تو کیا ہی گیا مگر اس کے ترجمے بھی اتنے اور اتنی زبانوں میں ہوئے کہ ہندوستان کی علاقائی زبان کے علاوہ تین تو صرف انگریزی کے ترجمے ہوئے ایک وہ جو رفیع احمد خان مرحوم نے کیا۔ دوسرا وہ جو ''گلوب'' لندن میں شائع ہوا اور تیسرا جو ''امرت بازار پتریکا'' میں نکلا۔ یہ ترجمے ہوتے رہتے اور یہ مضمون اس سے بھی زیادہ نئے نئے قالبوں میں ڈھلتا رہتا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر جس وجہ سے

مضمون میری چڑ بن گیا، وہ یہ تھی کہ اس کے بعد میں نے اور بھی بہت سے مضامین لکھے جن میں بعض خود مجھے "سودیشی ریل" سے زیادہ پسند تھے مگر ان مضامین کی داد بھی مجھ کو اس طرح ملتی کہ:

"خوب ہے صاحب آپ کا یہ مضمون بھی، جواب نہیں ہے مگر سودیشی ریل کا"

ادبی رسائل کی طرف سے فرمائشیں کچھ اور قسم کی آتی تھیں کہ ہمارے لیے آپ سودیشی ریل کی قسم کا ایک سودیشی ڈاک خانہ لکھ دیجیے اور ہمارے لیے ایک مضمون سودیشی یونیورسٹی کے نام سے لکھ دیجیے جو آپ کی سودیشی ریل کی قسم کا ہو۔ عاجز آگیا تھا ان فرمائشوں سے اور سچی بات تو یہ ہے کہ جلنے لگا تھا سودیشی ریل کے نام سے کہ اس ایک مضمون نے مجھ کو ایک عجیب سودیشی جھنڈا بنا کر رکھ دیا ہے۔ لاکھ لوگوں سے کہتا کہ خدا کے لیے سودیشی ریل لکھنے کے اس قصور کو بخش دو مگر توبہ کیجیے کہ وہ کہاں بخشنے والے تھے خط و کتابت ہو یا آمنے سامنے کی گفتگو۔ یہ بات ــ وہ بات اور سودیشی ریل اور میرا یہ حال کہ جس طرح بعض لوگ امرتی سے یا گلاب جامن سے چڑنے لگے ہیں کہ جہاں امرتی اور گلاب جامن کا نام آیا۔ وہ پٹری سے اترے اور لگے اول فول بکنے۔ کچھ اس قسم کی کیفیت میں میں اپنے کو مبتلا ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ حالاں کہ اس کیفیت کو چھپانے کے لیے بظاہر سودیشی ریل کے ذکر پر مسکرایا کرتا تھا مگر کسی کو کیا معلوم کہ اس مسکراہٹ کی تہہ میں کتنے پیچ و تاب ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کا تو ذکر نہیں ان کو تو ڈانٹ بھی دیتا تھا کہ کیا سودیشی ریل کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ دوسرے مضامین بھی تو دیکھو مگر ان بزرگوں سے کیا کہتا جو مجھ کو کسی طرح بخشنے کو تیار نہ تھے۔ ریل میں کسی کو ذرا سی تکلیف ہوئی اور اس نے سودیشی ریل کو اور اس کے ساتھ ہی مجھ کو یاد کیا۔ حد یہ ہے کہ تقسیم ملک کے بعد بھی اس سلسلہ نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی ایسے بزرگ کا ایک دن پوسٹ کارڈ چلا آرہا ہے کہ بلرام پور جا رہا تھا۔ گورکھ پور پہنچ گیا ہوں۔ سودیشی ریل یاد آرہی ہے تجھے ہم ولی......"

اگر کسی کو سکنڈ کلاس ٹکٹ لے کر تھرڈ یا انٹر میں داخل کرنے پر مجبور ہونا پڑا تو اس نے سودیشی ریل کا نعرہ بلند کر دیا۔ خیر یہ سلسلہ آج تک جاری ہے کہ ٹرین لیٹ ہو جائے تو سودیشی

ریل، اس کا ایندھن ختم ہو جائے تو سودیشی ریل، اس کی رفتار سست ہو جائے تو سودیشی ریل مگر میں تو اس وقت کا ذکر کر رہا ہوں جب سودیشی ریل کا میں ڈرائیور بن کر رہ گیا تھا کہ جو بھی مجھ سے ملا جس سے ملا، اس کو سودیشی ریل چلانے کے علاوہ اور مجھ کو کسی قابل نہ سمجھا اور میری قسمت میں صرف یہی ایک مضمون گفتگو رہ گیا۔

یہ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ شملہ میں علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری کے یہاں قیام کی سعادت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر جعفری کا مزید تعارف کرانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے دو صاحب زادگان کا ذکر کیا جائے جو پاکستان میں بہت کم لوگوں کے لیے اجنبی ہوں گے ایک مشہور صحیفہ نگار سید فرید جعفری ہیں اور دوسرے مشہور سی۔ اے۔ سی۔ پی آفیسر سید سعید جعفری جو لاہور کی ڈپٹی کمشنری سے لے کر مختلف محکموں کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔ بہر حال میرے ادبی مراسم چوں کہ سید فرید جعفری سے تھے، لہٰذا انہوں نے شملہ میں مجھ کو کہیں اور ٹھہرنے نہ دیا اور ہوٹل سے زبردستی میرا سامان گھر لے آئے۔ یہاں ان کے والد محترم علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین جعفری سے شرف نیاز حاصل ہوا اور اپنی اولاد کے تو باپ سے زیادہ دوست تھے ہی۔ میرے ساتھ بھی خوردی اور بزرگی کا رشتہ چھوڑ کر وہی دوستانہ مراسم شروع کر دیے۔ ہر چند کہ ان کے علمی تبحر اور ادبی ہمہ گیری کے مقابلے میں میری کوئی حیثیت نہ تھی اور میں اس قابل بھی نہ تھ کہ ان کے سامنے لب کشائی کر سکوں۔ مگر انہوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ مجھ سے کوئی بلند یا میں ان سے کوئی پست حیثیت رکھتا ہوں۔ ایک سطح پر آ کر ایسا مشفقانہ رویہ اختیار کرنا کہ اس پر بزرگانہ شفقت کا بھی گمان نہ ہو، یہ ان کا وہ کمال تھا جس کی مثال پھر کبھی کہیں نہ مل سکے گی۔ مگر ان بزرگ محترم نے بھی ادھر ادھر کی باتوں کے بعد سودیشی ریل کا ذکر آخر چھیڑ ہی دیا اور ان مقررہ باتوں کے علاوہ جو اس سلسلہ میں سب ہی کرتے تھے۔ ایک نئی بات یہ بھی کہی کہ اس کو مضمون کی صورت میں لکھ کر آپ نے اس کی ہمہ گیری اور اس کے پُر محل ہونے کا حق ادا نہیں کیا ہے اس کو اب بھی کتابی صورت میں شائع کر دیجیے۔

اسی شام سر محمد ظفر اللہ خان کو ملنے ان کی کوٹھی پر گیا جو ان دنوں وائسرائے کی ایگزیکٹیو

کونسل میں ریلوے ممبر تھے یہاں ایک غلط فہمی یہ پیدا ہو سکتی ہے کہ چوں کہ سر ظفر اللہ ریلوے ممبر تھے اور میں نے سودیشی ریل لکھی تھی۔ لہٰذا یہ ملاقات اس نسبت کے تحت ہوئی ہوگی۔ حالاں کہ اس ملاقات کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ سر ظفر اللہ جب کبھی لکھنؤ جاتے مجھ کو برابر طلب فرماتے رہتے تھے۔ لہٰذا اب میں شملہ آیا تھا تو میرا فرض تھا کہ میں ان سے ملتا چنان چہ وہاں بھی نہ تو شعر و شاعری کا تذکرہ چھیڑا نہ کوئی اور ادبی بحث۔ ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد کہنے لگے کہ آپ نے سودیشی ریل میں اس قدر اختصار سے کیوں کام لیا ہے لذیذ حکایت تو دراز ہونا چاہیے۔ اسے کتابی صورت میں چھپنا چاہیے تھا۔ اب تو مجھے قائل ہونا پڑا کہ:

یہ ہر زمیں رسید آسماں پیدا است

مگر اب میرے ذہن میں بھی یہ خیال کچھ جم سا گیا کہ اگر یہ سب کہہ رہے ہیں تو کیا مضائقہ ہے کہ اس کو اچھی چھوٹی سی کتاب کی حیثیت سے شائع کر دیا جائے۔ چنان چہ میں نے سر ظفر اللہ کے یہاں سے واپس آ کر خان بہادر ڈاکٹر نجم الدین جعفری سے یہی کہا کہ جو کچھ آپ فرما رہے تھے۔ وہی بات سر ظفر اللہ نے بھی کہی ہے اور اب میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس اجمال کو واقعی تھوڑی تفصیل میں لا کر کتابی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر جعفری نے مشوروں کے دفتر کھول دیے کہ اول تو اس پلاٹ میں تھوڑا سا پھیلاؤ پیدا کیا جائے۔ دوسرا اسی کتاب میں انگریزی ترجموں میں سے ایک ترجمہ بھی شامل کر دیا جائے۔ تیسرے اس کو سر ظفر ہی کے نام معنون کر دو۔

میں بے ساختہ بول اٹھا: چوتھے اس کا مقدمہ ڈاکٹر نجم الدین جعفری سے لکھوایا جائے۔ بڑی زور سے ہنسے مگر فوراً سنجیدہ ہو کر کہا:

''میں اس مقدمہ بازی کے لیے تیار ہوں اور مجھے بڑی مسرت ہوگی اس پر مقدمہ لکھتے ہوئے۔''

شملہ سے واپسی کے بعد میں نے سودیشی ریل کے اجمال کو تفصیل میں لانے کا کام شروع کر دیا۔ اتفاق سے اس زمانہ میں دہلی کے مشہور آرٹسٹ سمیع دہلوی لکھنؤ آئے ہوئے

تھے اور لکھنؤ میں ان کی انگشتری گھڑی کے بڑے چرچے تھے کہ اس گھڑی کے بہانہ یہ فن کار سارے شہر کو انگلیوں پر نچاتا پھرتا۔ تو اب سائل مرحوم نے تو صرف یہی کہا تھا کہ:

انگلیاں اٹھنے لگیں داغ کا داماد آیا

مگر ان کے لیے تو کسی ایسے مصرعے کی ضرورت تھی جو اس قسم کا ہوتا کہ:

انگلیاں اٹھنے لگیں انگی گھڑی والا آیا

بہر صورت سمیع صاحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے عرض کیا کہ سودیشی ریل کو کتابی شکل میں پیش کرنا ہے۔ لہٰذا اس کی صورت گری آپ سے بہتر کون کر سکتا ہے۔ کہنے لگے مصروف بہت ہوں بہر حال دیکھا جائے گا اور پھر انگلی میں وقت دیکھ کر کہا:

"ابھی دس منٹ باقی ہے موہن لعل سکسینہ کے آنے میں، جن کو میں وقت دے چکا ہوں جب تک تمہارا ایک اسکیچ ہی بنا دوں۔ ادھر دیکھو دروازے کی طرف۔" اور بجائے دس منٹ کے غالباً چھ سات منٹ میں انہوں نے ایک اسکیچ گھسیٹ دیا اور فرمایا کہ:

"ایک تو یہ اسکیچ جائے گا اس کتاب میں۔ دوسرے میں اس کا سرورق بنا دوں گا۔"

قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

بس یہی دو چیزیں اس کتاب کو غیر فانی بنا دینے کے لیے کافی ہیں۔

سمیع صاحب نے اس موقع پر کسر نفسی کو، خاکساری کو ضروری نہ سمجھا بلکہ سگار کا کش لیتے ہوئے ان صاحب کو موقع دیا کہ وہ اس قسم کی چند باتیں اور کہیں اور جب انہوں نے اور کوئی بات نہ کہی تو سمیع صاحب نے اپنے اس سگار کی تاریخ پر روشنی ڈالنا شروع کر دی کہ:

"ہاؤس آف لارڈز کے صرف چند ڈیوک اور ارل ایسے ہیں جو یہ سگار پینے کی ہمت اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ مولانا محمد علی البتہ کبھی کبھی یہ سگار پیتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ میں نے اپنے ایک دوست سے ایک بکس منگا لیا تھا۔ اب وہ ختم ہو رہا ہے اور میں پریشان ہوں کہ اب کیا ہوگا؟" اور پھر انگلی میں وقت دیکھ کر کہا کہ: "ارے کوئی ہے؟" اور ملازم لڑکا جب دوڑا ہوا سامنے آ گیا تو اس سے کہا: "دیکھ ایک کانگریسی لیڈر ہیں موہن لعل سکسینہ وہ اگر آئیں تو ان سے

کہہ دینا کہ آپ نے صاحب جو وقت لیا تھا وہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اب ملاقات نہیں ہو سکتی۔"

اتنے بڑے آرٹسٹ سے سرورق بنانے کا وعدہ لے کر اور اسکیچ بنوا کر میں تو ادھر سودیشی ریل کے اجمال کو تفصیل میں لانے میں مصروف ہو گیا۔ ادھر خان بہادر ڈاکٹر نجم الدین جعفری سودیشی ریل کا مقدمہ لکھتے رہے اور سر محمد ظفر اللہ نے میری استدعا پر اپنی تازہ تصویر بھی بھیج دی اور مجھ کو اس کی اجازت بھی دے دی کہ میں سودیشی ریل کو ان کے نام ممنون کر دوں۔ اس دوران ڈاکٹر نجم الدین جعفری کا ایک خاص مکتوب بھی ملا جس میں مجھ کو بزرگانہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اس کتاب کی طباعت وغیرہ کے سلسلہ میں یا اس کی کاپیاں اعانتاً خریدنے کے سلسلہ میں اگر کوئی سرکاری پیش کش ہو تو اس کو ہرگز قبول نہ کرنا۔ اس لیے کہ تم نے یہ مضمون خالص ادبی نیت سے لکھا ہے اور تمہارا مقصد کوئی پروپگنڈہ ہرگز نہ تھا۔ لہٰذا بلا وجہ کوئی لیبل کیوں، اس کتاب پر لگے۔ ڈاکٹر جعفری کا یہ مشورہ اس قدر مناسب تھا کہ اس کا احساس مجھ کو اس وقت ہوا جب لکھنؤ کانگریس سیشن کے موقع پر چند کانگریسی رہنماؤں کی محفل میں پنڈت کشن پرشاد کول نامی ایک بزرگ نے سودیشی ریل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس کے تمام نسخے خرید کر جلا دینا چاہیے۔ تو پنڈت مدن موہن مولوی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اس طرح آپ گویا اپنے اوپر طنز کرنے والے کو انعام دینا چاہتے ہیں کہ وہ روز ایک ایڈیشن چھاپے۔ روز آپ وہ پورا ایڈیشن خریدیں اور روز اس کو جلائیں۔ بجائے اس اشتغال کے آپ کتاب سے یہ کام بھی تو لے سکتے ہیں کہ اس میں اپنی خامیوں کو دیکھیں اور ان کی اصلاح کی کوشش کریں، گویا میرے دن پھر جانے کا ایک موقع پر ہاتھ آ گیا تھا مگر وہ بھی ایک بزرگ کے تعصب سے مجھ کو حاصل نہ ہو سکا اور میں سودیشی ریل لکھنے کے باوجود کھدر ہی رہا۔

(۹)

لالہ دیش بندھو گپتا کے اخبار روزنامہ "تیج" دہلی کے ایڈیٹر شری رام لال ورما، مالکانِ "تیج" سے کسی بات پر لڑ جھگڑ کر لکھنؤ آ گئے تھے اور لکھنؤ سے اپنا ذاتی روزنامہ "ہند" نکالنے

کے لیے نہایت وسیع انتظامات میں مصروف تھے۔ لکھنؤ میں ان کے مشیر خاص جناب امین سلونوی تھے جو اس طرح کے انتظامات میں برابر کے شریک تھے۔ گویا اس اخبار کی کامیابی یا ناکامی خود ان کی ہی عزت و آبرو کا سوال تھا۔ چنان چہ آج کل وہی مجھ کو گھیرے ہوئے تھے کہ میں روزنامہ ''ہند'' کی کچھ اس قسم کی ذمہ داری سنبھالوں کہ ادارت میں کروں اور نام ہو شری رام لال ورما کا۔ دوسری طرف مولوی عبد الرؤف صاحب عباسی مجھے اپنی طرف کھینچ رہے تھے کہ میں ان کے روزنامہ ''حق'' سے وابستہ ہو جاؤں۔ خیر ان کو تو میں صاف جواب دے چکا تھا کہ میں دوستی کو ملازمت پر قربان نہیں کر سکتا مگر امین سلونوی صاحب وہ بلائے بے درماں تھے کہ ان سے مفر ممکن نہ تھا۔ آخر کار شری رام لال ورما سے شرائط طے ہوئیں۔ تنخواہ کا مول تول ہوا اور جب میں نے دیکھا کہ میری ہر شرط وہ منظور کر چکے ہیں تو اخبار ''ہند'' سے وابستہ ہونا ہی پڑا۔

شری رام لال ورما تو نہایت معقول اور نستعلیق قسم کے آدمی تھے جو باوجود کھدر پہننے کے مزاجاً نہایت ریشمی آدمی واقع ہوئے تھے مگر ان کے تھے ایک سالے جن کا نام اس وقت ذہن میں نہیں اس لیے کہ ان کو روزنامہ ''ہند'' کا پورا عملہ لالہ گزبڑ لال ورما ہی کہا کرتا تھا اور ان کا یہ نام ان کے اصل نام سے زیادہ زبانوں پر تھا اور تھے بھی وہ ایسے ''زبڑ'' قسم کے آدمی کہ اگر ان سے پوچھا جا سکتا تھا تو صرف یہ کہ ''اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی'' مگر ان کو جنرل منیجر بنا دیا گیا تھا حالاں کہ ان بے چارے کو اخباری صنعت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ حد یہ کہ کاغذ کے مختلف سائز بھی ان کی سمجھ میں نہ آتے تھے کہ یہ 29×22 اور 18×22 کیا بلا ہے۔ کتاب کی روشنائی اور بلیو بیک میں فرق کیا ہوتا ہے وہ یہ کبھی سمجھ ہی نہ سکے۔ البتہ جس ایک کام میں وہ ماہر تھے وہ یہ تھا کہ اپنے بہنوئی کے ڈھول پیٹتے رہیں اور اگر ہو سکے تو ان کو اوتار بنا کر دنیا کے سامنے پیش کریں۔ میں اگر ڈرتا تھا تو صرف ان کی حماقت مآبی سے ڈرتا تھا اور میرے دل کو کچھ یقین سا ہو گیا تھا کہ یا تو ان کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے یا میرے ملک الموت اگر ثابت ہوں گے تو صرف یہ۔ ان کی ایک ایک بات پر خون کے گھونٹ پی کر رہ

جانا پڑتا تھا اور یہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جانے کی بات بھی ہے۔ مثلاً چلے آرہے ہیں اپنی دھوتی سنبھالے اور پیر سے نکل بھاگنے والی چپل کا پیچھا کرتے ہوئے کہ:

> ''شوکت صاحب آج ایڈیٹوریل نہ لکھیے گا۔ آج بھی صاحب خود لکھ رہے ہیں کہ پرچے کی مانگ بہت بڑھ جائے گی ''تیج'' میں تو یہ ہوتا تھا کہ جس دن بھائی صاحب کا ایڈیٹوریل ہوتا تھا ہزار بارہ سو پرچہ زیادہ چھاپا جاتا تھا۔''

عرض کیا کہ:

> ''بس اتنا ہی یہاں بھی بڑھوا دیجیے گا مگر ہاکروں کو سمجھا دیجیے کہ وہ بجائے خبروں کی سرخیوں کی آواز لگانے کے ایڈیٹوریل کی آواز لگائیں۔''

کہنے لگے ''یہ ٹھیک ہے۔'' عین اسی وقت کسی کاتب نے کسی کو زور سے آواز جو دی تو یہ گڑبڑا کر اٹھے اور دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچے کہ یارو کچھ تو خیال کرو بھائی صاحب ایڈیٹوریل لکھ رہے ہیں اور تم یہاں چیخ رہے ہو۔ ''تیج'' میں تو یہ ہوتا تھا کہ جس دن بھائی صاحب ایڈیٹوریل لکھتے تھے ایک مکمل سناٹا رکھا جاتا تھا۔ چپراسی ہر طرف دبے پاؤں گھومتے رہتے تھے کہ جہاں کسی نے ذرا سی بھی اونچی آواز میں بات کی اور وہ اس کو خاموش کر دیتے تھے اور پھر بیٹھے ہیڈ کاتب سے مشورہ کر رہے ہیں کہ بھائی صاحب جو ایڈیٹوریل لکھ رہے ہیں وہ کس کاتب سے لکھوایا جائے۔ ''تیج'' میں تو یہ ہوتا تھا کہ جس دن بھائی صاحب ایڈیٹوریل لکھتے تھے منشی عبدالستار پروین رقم کو بلایا جاتا تھا اور انہیں وہ ایڈیٹوریل لکھوایا جاتا تھا۔ ان کے ذمے صرف بھائی صاحب کا ایڈیٹوریل لکھنا ہوتا تھا اور ہفتہ میں زیادہ سے زیادہ ایک مرتبہ ان کی طلبی ہوتی تھی مگر جیسا بھائی صاحب کا ایڈیٹوریل ہوتا تھا ویسے ہی منشی عبدالستار پروین رقم موتی پرو دیتے تھے۔ کاتب تو آپ جانتے تھے کہ کس خوش نویسی کے ساتھ بڑے بڑوں کو احمق بنا دیتے تھے۔ وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہتے کہ صاحب اتنا بڑا کاتب تو یہاں

چراغ لے کر ڈھونڈے بھی نہ ملے گا۔ البتہ یہ ایڈیٹوریل آجانے دیجیے۔ میں خود اس کو منشی شمس الدین کے مزار پر بیٹھ کر لکھ لاؤں گا اور اس پر وہ سنجیدگی کے ساتھ چونک پڑتے کہ ”نہ نہ نہ۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ یہ ایڈیٹوریل دفتر کے باہر جائے۔ ”تیج“ میں ایک مرتبہ یہی ہوا تھا کہ بھائی صاحب کا ایڈیٹوریل منشی پروین رقم نے گھر پر لکھنے کو منگا لیا۔ نہ جانے وہ ایڈیٹوریل کس طرح ”ہندوستان ٹائمز“ کے ہاتھ لگ گیا لہذا دوسرے دن اسی کا ترجمہ ”ہندوستان ٹائمز“ کا ایڈیٹوریل بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد سے سخت احتیاط کی جاتی ہے، کہ بھائی صاحب کے ایڈیٹوریل کی تو کسی کو چھپنے سے پہلے ہوا بھی نہ لگے اور اسی وقت گلی میں اگر باہمی کشیدگی کی وجہ سے چند کتوں میں تو تو میں میں ہو گئی تو ہمارے گزبڑلال ورما کی سراسیمگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی کہ بھائی صاحب ایڈیٹوریل لکھ رہے ہیں اور یہ نامعقول کتے شور برپا کیے ہوئے ہیں۔ وہ ان کتوں کو کبھی چپل گھسیٹ کر مارتے تھے کبھی ان کے پیچھے دوڑتے تھے اور اگر بھائی صاحب کے ایڈیٹوریل لکھنے کا خیال نہ ہوتا تو شاید ان پر بھونکنا شروع کر دیتے۔

یہ گھبراہٹ اور یہ وحشت ایک دن کی بات نہ تھی۔ یہ تو ان کی روزمرہ کی بے ساختگی تھی، کام تھا جنرل منیجری جو بے چارے کلرک کرتے تھے۔ اس لیے کہ اول تو یہ کام آتا ہی نہ تھا اور اگر آتا بھی ہوتا تو بھائی صاحب کی قصیدہ خوانی سے ان کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہوتے۔ روزانہ ڈاک کا پلندہ لے کر میرے کمرے میں آتے تھے اور سب سے پہلی بات یہی کرتے کہ آج کی ڈاک میں بھی ”تیج“ آیا ہے۔ گویا اب تک تو بند ہوا نہیں۔ ورنہ عام خیال یہ تھا کہ بھائی صاحب کے آجانے کے بعد اس کا ایک ہفتہ بھی نکالنا مشکل ہو جائے گا۔ اشاعت تو سنا ہے کہ ہزاروں سے گر کر ایک چند سو تک رہ گئی مگر دھرم پال گپتا وغیرہ اس کو زبردستی اور نقصان اٹھا اٹھا کر نکالے جا رہے ہیں، مگر دیکھ لیجیے کیا حال ہو گیا ہے۔ عجیب عجیب قسم کے ایڈیٹوریل نکل رہے ہیں اور سنا ہے کہ دہلی میں جتنے ”تیج“ پڑھنے والے تھے وہ اب ہاکروں سے ”ہند“ مانگ رہے ہیں اور ”تیج“ اٹھا اٹھا کر ہاکروں کے منہ پر مار رہے ہیں۔ کبھی کوئی مراسلہ لیے چلے آ رہے ہیں کہ یہ دیکھیے شوکت جی یہ لکھتا ہے کہ اردو صحافت میں ”ہند“ کا

اضافہ اردو اخبارات کی بلند اقبالی ہے۔ میرے خیال میں یہ مراسلہ ذرا جلی قسم سے لکھوا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ میں اس کی بے ہودہ باتوں کو اس کان سن اس کان اڑا دیا کرتا تھا اور اس بات سے شری گڑبڑ لال ورما مجھے کوئی خاص مشورہ کرنے کو اپنے کمرے میں بلاتے تھے تو آپ بھی نہایت معتبر بن کر بلا وجہ آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے جن کو دیکھتے ہی رام لال جی کی تیوریوں پر بل پڑ جاتے تھے مگر ''ساری خدائی ایک طرف'' کو آخر کیا کرتے۔ اگر وہ خاموش بیٹھے رہتے تو پھر بھی غنیمت تھا مگر وہ اخبار کی سیاسی پالیسی میں بھی دخل دینا شروع کر دیتے تھے اور اس وقت رام لال جی کو مجبوراً کہنا پڑتا تھا کہ یہ بڑا اہم مشورہ ہے۔ آپ ذرا دس منٹ کے لیے ہم کو تنہا چھوڑ دیں اور اس کے بعد آپ کی قیمتی رائے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ وہ جاتے ہوئے کہتے کہ ٹھیک ہے کہ پہلے آپ لوگ باتیں کریں اس کے بعد میں اپنی تجویز پیش کروں گا۔ بہرحال اخبار کا باتصویر ہونا بہت ضروری ہے۔

ان کے جانے کے بعد رام لال ورما منہ بنا کر دانت پیستے اور پھر نہایت بے زاری کے ساتھ پوچھتے کہ:

> ''ان کا کچھ علاج بتائیں شوکت صاحب۔ یہ تو میرے لیے سانپ کے منہ کے چھچھوندر بن کر رہ گئے ہیں۔ جو نہ نگلی جائے نہ اگلی جائے۔ اپنے نزدیک یہ بڑا خلوص برتتے ہیں مگر خدا محفوظ رکھے ایک بے وقوف کے خلوص سے زندگی عذاب ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ میری بیوی کے بھائی ہیں۔ بے روزگار تھے لہذا میں اس کو یہاں لے آیا ہوں لیکن بجائے کوئی مدد کرنے کے یہ تو میرے لیے مشکلات پر مشکلات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ایسی سڑی ہوئی بات کرتے ہیں کہ دماغ پراگندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔''

اب میں ان سالے بہنوئی کی بات میں کیا دخل دیتا۔ البتہ یہ ضرور ان کے کان میں ڈالتا رہتا کہ اگر یہ حضرت میرے ناصح مشفق بننے کی کوشش کریں گے تو کسی نہ کسی دن بات بڑھ

جائے گی۔ مگر رام لال ورما نے مجھ کو یہی بات مشورہ دیا کہ آپ ان کو زیادہ منہ لگایئے ہی نہیں اور اس قسم کی باتوں پر ان کو ڈانٹ دیا کیجیے۔ کہنے کو تو رام لال ورما نے کہہ دیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ گھٹنے پھر بھی پیٹ کی طرف جاتے ہیں۔ رشتہ داری پھر بھی رشتہ داری ہے اور سسرالی رشتہ داری تو بہت ہی نازک ہوتی ہے۔ لہٰذا میں ان گڑبڑ رام ورما کی باتیں جہاں تک ہو سکا برداشت کرتا رہا۔ مگر ایک دن وہ نوبت آ ہی گئی کہ جس کا ڈر تھا۔ یہ حضرت کاتب کے پاس سے میری ایک نظم لے کر آ گئے کہ:

> ’’شوکت جی اس نظم کی اس رباعی کو ذرا پھر دیکھ لیجیے میرے خیال میں اس میں سکتہ پڑتا ہے۔‘‘

میں آپ کو کیا عرض کروں کہ مجھ کو کتنا غصہ آیا ہے مگر میں نے اس غصہ کو پی کر صرف یہ کہا کہ بجائے ان سے کچھ کہنے کے میں نے اس کاتب کو طلب کیا جس کو یہ نظم لکھنے کو دی گئی تھی اور اس پر سارا غصہ اتارتے ہوئے کہا کہ: ’’میری لکھی ہوئی چیز تم نے ان کو کیوں دی اور یہ کیوں کر تمہارے پاس سے یہ نظم لے کر میرے پاس آئے۔‘‘ کاتب بے چارہ بھی بے قصور تھا اس نے کہا: صاحب میری کیا مجال تھی کہ ان کو روکتا۔ انہوں نے نظم اٹھا کر پڑھی اور کہا کہ شوکت جی نے جلدی میں اس نظم کو دوبارہ دیکھا نہیں۔‘‘ میں نے غصے سے کہا:

> ’’اتنا جاہل ہے کہ نظم میں رباعی کہتا ہے وہ لایا ہے نظم میرے پاس کہ میں اپنی غلطی پر نظر ثانی کروں۔ خبردار جو آئندہ میری کوئی تحریر یا کوئی نظم بغیر میری اجازت کے کسی اور کو دکھائی تم لوگوں نے، اور آپ بھی کان کھول کر سن لیجیے مسٹر کہ میں اس قسم کی بے ہودگی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوں گا۔‘‘

میں ابھی نہایت بلند آواز سے یہ بات کر ہی رہا تھا کہ رام لال ورما بھی گھبرائے ہوئے میرے کمرے میں آ گئے اور جب ان کو یہ قصہ معلوم ہوا تو ان کے نتھنے بھی پھول گئے اور انہوں نے بھی تیوریوں پر بل ڈال کر اپنے سالے سے کہا کہ:

> "آپ کی اپنے متعلق غلط فہمیاں کچھ بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ آپ کو اتنے دن کے بعد یہ پتہ نہ چلا کہ شوکت صاحب میرے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں اور میرے اخبار کے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کو نہ شاعری کی خبر نہ شاعری کی دم کی۔ آپ کو آخر حق کیا تھا اس حماقت کا۔"

میں نے ان کا غصہ دھیما کرتے ہوئے کہا:

> "حماقت کسی حق کی محتاج نہیں ہوتی جو کچھ ان سے کہنا تھا میں خود کہہ چکا ہوں اور امید ہے کہ آئندہ یہ محتاط رہیں گے۔"

اس دن سارے دفتر میں صرف ایک ہی چرچا تھا کہ آج شوکت تھانوی نے اس ہاتھی کی وہ لاجواب کھال اتاری ہے کہ طبیعت خوش ہو گئی۔ شری گڑبڑ رام اس دن کے بعد سے میرے کمرے کے سامنے سے بھی گزرتے تھے تو پنجوں کے بل اور جب کبھی میں ان کو اپنے کمرے میں بلاتا تھا وہ اس وقت تک کھڑے ہی رہتے تھے جب تک میں ان سے بیٹھنے کو نہ کہوں۔ یوں تو روزنامہ "ہند" کی فضائیں اب میرے لیے سازگار ہو چکی تھیں مگر دوسرے ہی مہینہ اختتام پر معلوم ہوا کہ اس ملازمت میں تنخواہ ملنا کوئی ضروری بات نہیں ہے۔ پہلی تاریخ سے پندرہ تاریخ ہو گئی مگر تنخواہ کا کوئی ذکر نہ تھا پندرہ تاریخ کے بعد شعبۂ کتابت نے کچھ گڑبڑ شروع کر دی۔ اس گڑبڑ میں مترجم، پھر کچھ اسسٹنٹ ایڈیٹر شامل ہو گئے اور آخر کار رام لال ورما نے مجھ سے کہا کہ:

> "شوکت صاحب میں بالکل پھکڑ ہو چکا ہوں اور اب میرے لیے اخبار کو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا ہے۔ دو دو مہینہ کی تنخواہ سارے عملے کی چڑھی ہوئی ہیں لہٰذا میں تو اخبار بند کر رہا ہوں۔"

چنانچہ یکم مئی کو نکلنے والا اخبار یکم جولائی کو بند کر دیا گیا اور سارا عملہ چیختا پیٹتا رہ گیا۔

(۱۰)

لکھنؤ کے خوش وضع اور ٹکسالی لوگ شیروانی کے سب بٹن شاذ و نادر ہی لگاتے ہیں اور عموماً نیچے دو تین بٹن لگا کر باقی کھلے چھوڑ دیتے ہیں اس لیے شیروانی کے علاوہ کرتا بھی تو قابل دید ہوتا ہے۔ جس کا مری پھندے سے کڑھا ہوا گریبان لکھنوی۔ سوزن کاری کا شاہکار ہوتا ہے۔ اگر اس گریبان کو شیروانی کے سب بٹن لگا کر چھپا دیا جائے تو اس صنعت کو آخر کیوں کر نظارہ سوز بنایا جائے یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی صاحب نہایت قیمتی ٹائی باندھ کر بند گلے کا کوٹ پہن لیں لیکن جن محترم کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ اس لکھنوی وضع کے دانستہ یا نادانستہ سخت باغی تھے۔ وہ شیروانی کے اوپر کے دو بٹن لگا کر باقی سب بٹن چھوڑ دیتے تھے۔ بہت قریب سے دیکھا جائے تب پتا چلتا تھا کہ وہ چھتری نہیں بلکہ شیروانی ہی پہنے ہوئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس شیروانی سے خواتین نے مروجہ غرارے کا تصور حاصل کیا ہے۔ یہ شیروانی پہنے اور سر پر ترکی ٹوپی رکھے جس کے چاروں طرف سفید بالوں کی جھالر سی لگی نظر آتی تھیں۔ یہاں تک کہ پیشانی پر بھی اس خوبی سے نکلے ہوئے بال چھائے ہوئے نظر آتے تھے۔ سید جالب دہلوی روزنامہ ''ہمدم'' لکھنؤ کے دفتر میں کرسی ادارت پر بیٹھے بیک وقت حقہ اور سگریٹ پیتے نظر آتے تھے کہ حقہ کی نے جس ہاتھ میں ہے اس کی چھنگلیا اور چوتھی انگلی کے درمیان ایک سلگتی ہوئی سگریٹ بھی ہے کہ کبھی حقہ کا کش لے لیا اور کبھی سگریٹ کا دم لگایا اور دوسرے ہاتھ میں دبا ہوا قلم مسلسل چلتا رہا۔

یہ واقعہ ۱۹۲۸ء کی اپریل کا ہے جب میں سب سے پہلے ان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا جن کو مولانا محمد علی چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا کہا کرتے تھے اور جو دنیائے صحافت میں بابائے صحافت کے نام سے مشہور تھے اور دنیا صحافت کو سید حبیب عارف، رحم ہاشمی، انیس احمد عباسی، حسن ریاض اور حامد حسرت ایسے خدا جانے کتنے صحافی بنا بنا کر مہیا کرتے جاتے تھے۔ میں ان اجاز صورت بابائے صحافت کو دیکھ کر کچھ زیادہ خوش عقیدہ نہ ہو سکا مگر مہاراجہ صاحب

محمود آباد کا تعارفی خط پھر بھی ان کی خدمت میں پیش کر دیا اور خط پڑھ چکنے کے بعد ایک نگہ نیم باز سے مجھ کو دیکھ کر اب جو انہوں نے مجھ ہی سے میرا تعارف کرانا شروع کر دیا تو مجھے اعتراف ہے کہ اپنے خاندانی حالات سے میں خود اتنا واقف نہ تھا جتنے واقف یہ محترم نکلے۔ تھانہ بھون کی وجہ تسمیہ سے لے کر مولانا اشرف علی تھانوی کے تمام لٹریچر پر بغیر سانس لیے ایک رواں تبصرہ کرتے چلے گئے۔ میرے دوسرے چچاؤں کا مجھ سے تعارف کرایا۔ میرے والد جو اپنی باتیں انتظاماً مجھ سے چھپائے ہوئے تھے وہ سب مجھ پر ظاہر کیں۔ والد محترم کو اس زمانہ میں تنفس کی شکایت تھی لہٰذا اس مرض کے اسباب وعلل پر سیر حاصل بحث کی اس کے بعد یونانی نسخے بتائے مغربی ممالک میں اس پر جتنا ریسرچ ہوا ہے وہ سب تاریخ وار بتایا اور آخر میں یہ آزمودہ نسخہ بتایا کہ اگر ایک گلاس میں تازہ پانی لے کر ناک سے کھینچا جائے تو یہ مرض ہمیشہ کے یے سو سکتا ہے۔ وہ مجھ کو یہ علاج غالباً اس لیے بتا رہے تھے کہ اگر میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں تو یہ مرض مجھ کو آج نہیں تو کل ضرور ہوگا اور اس وقت یہ علاج کام آئے گا۔ مگر مجھ کو ان کی اس غیر متعلق تفصیل سے کچھ الجھن سی ہو رہی تھی اس لیے کہ میں تو صرف اس لیے آیا تھا کہ وہ مجھ کو روزنامہ ''ہمدم'' کے عملہ میں لے کر اپنی تربیت کا شرف عطا کریں۔ آخر بمشکل تمام وہ اس رخ پر لے آئے اور مجھے بتایا کہ تم آج رات سے خبروں کے ترجمے سے اخبار نویسی کی ابتدا کرو اور تفصیلات معلوم کرنے کے لیے مجھے کہا کہ قاضی حامد حسرت کے پاس پہنچوں۔ سید صاحب کا میرے متعلق پرچہ ترکیب استعمال کو پہنچ چکا تھا۔ لہٰذا انہوں نے مجھے بتایا کہ میں رات کو بارہ بجے سے صبح پانچ بجے تک حاضری دیا کروں گا اور خبروں کا ترجمہ کیا کروں گا۔ جس کا معاوضہ مجھ کو پچاس روپے ماہوار دیا جائے گا۔

اللہ جانے کتنے دن میں یہ رت جگا کیا کہ ناگاہ ایک دن مجھے سید صاحب نے اپنی پیشی میں طلب کیا اور مجھے بتایا کہ امتیاز احمد اشرفی اسسٹنٹ ایڈیٹر رخصت پر جا رہے ہیں۔ لہٰذا میں ''ہمدم'' کا فکاہیہ کالم ''دو دو باتیں'' لکھ کر ان کو دکھاؤں تا کہ وہ اندازہ کر سکیں کہ یہ کالم میں لکھ سکوں گا یا نہیں۔ حسب الحکم میں نے وہ کالم بڑی محنت سے لکھ کر پیش کر دیا اور خود حسب

معمول ترجمہ کے شعبہ میں آ گیا۔ دل میں ایک خیال ضرور تھا کہ اللہ جانے اس کالم کا حشر کیا ہوا مگر جب سید صاحب کے دفتر سے اٹھ جانے کے بعد مجھ کو وہ کالم ان کی ردی کی ٹوکری میں نظر آیا تو خیال ہوا کہ شاید ابھی دیکھا ہی نہ ہو مگر تھوڑی ہی دیر میں شعبۂ کتابت سے وہ کالم لکھا ہوا مع اس اصل کے آ گیا جس پر سید صاحب نے لال روشنائی سے اتنی اصلاحیں دی تھیں کہ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ وہ خود ہی لکھ لیتے۔ کاغذ کا صفحہ اچھا خاصہ پانی پت کا میدان نظر آتا تھا۔ میں اس کی کاپی پڑھ کر ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ سید صاحب بہ نفس نفیس میری نشست کے قریب آئے اور فرمایا کہ یہ کالم لکھتا رہوں، ساتھ ہی رات کی حاضری معاف کر دی گئی اور صبح دفتر آنے لگا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس مہینے مجھ کو بجائے پچاس کے اسی روپیہ تنخواہ ملی مگر ہوتا یہی رہا کہ میرا کالم سید صاحب کی آپریشن ٹیبل سے لہولہان ہو کر کاتبوں کے پاس جاتا رہا اور وہاں سے میرے پاس آتا رہا۔ رفتہ رفتہ سرخ روشنائی کم ہوتی گئی اور وہ دن تو میرے لیے عید کا دن تھا جب اس کالم کی اصل پر ایک بھی سرخ نشان نہ تھا۔ طرح طرح کے خیال آئے کہ شاید آج سید صاحب کی طبیعت ناساز تھی یا شاید سید صاحب کسی اور کام میں مصروف تھے مگر دوسرے ہی دن سید صاحب نے یاد فرما کر اس کالم کا ذکر کیے بغیر حکم دیا کہ اب آپ شذرات بھی لکھا کریں اور ساتھ ہی ساتھ مجھ کو تازہ آئی۔ ڈی۔ ٹی تھما دیا گیا اور اس پر کچھ نشانات ہیں۔ ان میں کسی پر نوٹ لکھ کر دکھایے۔ میں نے کبھی ایک خبر پر کبھی دوسری پر نوٹ لکھنے کی کوشش میں کئی صفحات پھاڑ پھاڑ کر پھینکے۔ آخر ایک نوٹ بمشکل تمام لکھ ہی لیا اور سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔

مزاحیہ کالم ''دو دو باتیں'' تو اب براہ راست میرے پاس سے شعبۂ کتابت میں جاتا رہا مگر نوٹ سید صاحب کے ملاحظہ سے گزر کر شعبۂ کتابت میں جاتے تھے اور وہاں سے جب میرے پاس آتے تو مجھ کو طے کرنا پڑتا تھا یہ کہ میں کبھی ادارتی نوٹ لکھنے کے قابل نہ ہو سکوں گا۔ اس لیے کہ وہی لال روشنائی ہر طرف چھٹکی ہوئی نظر آتی تھی مگر کچھ ہی دن کے بعد یہ اصلاحیں اور ترمیمیں کم ہونے لگیں اور آخر ایک دن وہ بھی آیا جب ایک نہایت طویل نوٹ

میں صرف میرا ایک لفظ کٹا ہوا تھا ''نقطۂ نظر'' اور اس پر لال روشنائی سے لکھا ہوا تھا ''زاویۂ نظر'' معلوم نہیں کیوں اس دن مجھ کو سید صاحب پر سخت غصہ آیا کہ ان کو اصلاح کرنے کا کچھ شوق بھی ہے ورنہ محض نقطۂ نظر کو زاویۂ نظر بنانا کیا معنی رکھتا ہے۔ میں وہ نوٹ لیے دندناتا ہوا سید صاحب کے پاس جا پہنچا اور وہ نوٹ پیش کر کے عرض کیا کہ میں اصلاح کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ سید صاحب نے پہلے حقہ کا کش اور سگریٹ کا دم لے کر فرمایا: ''تشریف رکھیے'' اور اب جو ان کی تقریر شروع ہوئی تو کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ایک دریا ہے کہ رواں ہے اور میں اس میں ڈبکیاں کھا رہا ہوں۔ کہنے لگے کہ:

> ''آپ اخبار نویس ہیں، اخبار نویس وہ چور ہوتا ہے جو جسم پر تیل کی مالش کر کے چوری کرنے جاتا ہے کہ اگر پکڑا جائے تو پھسل جائے۔ اگر آپ نے اس موقع پر نقطۂ نظر رکھا تو آپ پھسلنے نہ پائیں گے۔ اس لیے کہ نقطۂ نظر کے معنی یہ ہیں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ آپ کی قطعی اور آخری رائے ہے آپ کی نگاہ ایک نقطہ پر مرکوز ہے لیکن اگر آپ نے زاویۂ نظر لکھ دیا تو میں اس میں نقطۂ نظر والی قطعیت اور تیقن نہیں ہے۔ رہ گئے آپ کے قارئین وہ نقطۂ نظر اور زاویہ نظر میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ لہٰذا آپ زاویۂ نظر ہی کیوں نہ لکھیں اور گرفت سے پھسل جانے کا امکان باقی رہنے دیں۔''

نتیجہ یہ کہ قائل ہو کر واپس آنا پڑا۔ ایک مرتبہ ایک نوٹ میں لفظ ''تیار'' جو میں نے 'ط' سے لکھ ہو تھا۔ سخت نادم ہوا کہ یہ املائی غلطی ہوگئی۔ لہٰذا دوسری مرتبہ طیار 'ط' سے لکھا مگر وہ بھی کٹ کر آگیا۔ اب اس پر 'ت' سے تیار لکھ ہوا تھ۔ اب پھر مجھ کو باریاب ہونا پڑا کہ آخر کیا بات ہے کہ جب میں 'ت' سے لکھتا ہوں تو آپ کاٹ کر طیار 'ط' سے لکھ دیتے ہیں اور جب میں طیار 'ط' سے لکھتا ہوں تو آپ اسے کاٹ کر 'ت' سے بنا دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں پھر ایک لیکچر سننا پڑا کہ 'ط' سے طیار اس طائر کو کہتے ہیں جو اڑنے کے لیے پر تول رہا ہوں اور 'ت' سے تیار

اس تیر کو کہتے ہیں جو کمان سے نکلنے ہی والی ہو۔ لہٰذا اگر آپ لکھیں کہ طیار پرواز کے 'ت' سے تیار تھا تو یقیناً غلط ہے۔ یہ طیار 'ط' سے ہوگا اور اگر آپ یہ لکھیں کہ گھوڑے دوڑنے کے لیے 'ط' سے تیار تھے تو یہ بھی غلط ہے یہ تیار 'ت' سے ہوگا۔ اپنا سامنہ لے کر پھر واپس آ گئے۔ دفتری فضاؤں کے باہر بھی احتیاط برتنا پڑتی تھی کہ کوئی بات ایسی نہ چھڑ جائے کہ سید صاحب کو اس بات کی جڑ سے لے کر پھنگی تک کی خبر لانا پڑے اور وہ ایسی تقریر شروع کر دیں جس کی کوئی حد ہی نہ ہو اور جس کے ختم ہونے کی کوئی دعا قبول نہ ہو سکے مگر شامت اعمال اس قسم کے مواقع فراہم کرتی ہی رہتی تھی۔ مثلاً سید صاحب امین آباد میں حلوہ سوہن خریدتے نظر آ گئے اور ان سے نہایت معصوم سا سوال کر دیا کہ:

"حلوہ سوہن خرید رہے ہیں آپ؟"

بس وہ شروع ہو گئے وہیں کہ:

"جی ہاں" مگر میں اس کے مٹھائی ہونے سے زیادہ دوا ہونے کا قائل ہوں اور تاریخی طور پر ثابت بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ دراصل بنیادی طور پر ہے بھی دوا ہی۔ شہنشاہ جہانگیر کثرت شراب نوشی کے باعث ایک زمانہ میں خشکی بڑھ جانے کے باعث رات کو نیند سے محروم ہو چکا تھا، حکمائے دربار اس فکر میں تھے کہ کسی طرح اس شب بے داری کی شکایت دور کرنے کا کوئی ایسا طریقہ نکالا جائے جو بظاہر علاج بھی معلوم نہ ہو اس لیے کہ شہنشاہ سے بمشکل یہ توقع تھی کہ وہ کڑوی کسیلی دوائیں پی سکیں۔ لہٰذا طبیب اعظم حکیم نظام الدین خان نے بھڑوں کے چھتے کی قسم کی ایک ایسی مٹھائی ایجاد کی جس کے سوراخوں میں زیادہ سے زیادہ گھی شہنشاہ کو کھلایا جا سکتا تھا شہنشاہ نے اس نئی مٹھائی کو بے حد پسند کیا لہٰذا اس کو زیادہ سے زیادہ پر تکلف بنا کر پیش کیا جانے لگا اور احتیاط یہ بھی ملحوظ رہی کہ معدے پر بار نہ ہو۔ رفتہ رفتہ اس مٹھائی نے شاہی خاندان میں عام رواج حاصل کر لیا۔ شاہی خاندان کے بعد امرائے دربار میں یہ مقبول ہوئی یہاں تک کہ عام حلوائیوں نے اس کو بنانا اور اس کو ترقی دینا شروع کر دیا۔ راجہ ٹوڈرل کے خاندان کے ایک رئیس راجہ سوہن لال نے جو اس مٹھائی کے بے حد دل دادہ تھے اس کو

باقاعدہ حلوے کی حیثیت دے کر ان کا نام حلوۂ سوہن رکھا مگر حلوۂ سوہن تیار کرنے میں مسلمان حلوائیوں کو ہمیشہ امتیاز حاصل رہا۔ دہلی میں گھنٹہ گھر کے مشہور حلوائی میاں حیات کا حلوۂ سوہن بے حد مشہور تھا۔ اب ہندو حلوائی بھی اس کی تیاری میں سلیقہ دکھاتے ہیں مگر حلوۂ سوہن کو حیات ابدی حیات حلوائی ہی نے دی۔

یہ حلوۂ سوہن نامہ صرف اتنا ہی نہ تھا بلکہ اس کی پشت پر غدر تک کی پوری تاریخ تھی اور ایک حلوۂ سوہن پر کیا منحصر ہے کوئی ذکر چھیڑ دیجیے:

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار

عجیب منظر تھا وہ بھی، جب سید صاحب روزنامہ ''ہمدم'' سے سبک دوش ہو رہے تھے اور ''ہمدم'' کے عملہ نے الوداعی گروپ فوٹو لینے کے لیے ان کو زحمت دی تھی۔ حسب معمول ازار بند لٹک رہا تھا۔ میں نے اس طرف توجہ مبذول کی تو آپ کے صاحب زادے سید عشرت حسین نے کہا:

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دل آرام را

سید صاحب نے بیٹے کو دیکھا اور عجیب انداز سے کہا ''باپ کا چہرہ؟ روئے دل آرام؟ جیتے رہو عشرت میاں۔''

* * *

بیادِ شوکت

شوکت تھانوی مرحوم

عبدالماجد دریابادی

"شوکت تھانوی" کے ساتھ مرحوم کا الحاق کیسا عجیب سا معلوم ہوتا ہے گویا اجتماع ضدین! لیکن بالآخر جو ہونا تھا واقع ہو کر رہا۔ زندگی اور زندہ دلی اگر کبھی مجسم ہو کر گوشت و پوست کی شکل میں سامنے آسکتے تو وہ شاید شوکت تھانوی ہوتے اور یہ اگر کہیں یونانیوں کے دور میں ہوئے ہوتے تو عجیب کیا کہ زندہ دلی و ظرافت کے ساتھ چھوٹے موٹے دیوتا مان لیے گئے ہوتے! موت کے بس سے اگر کسی کا باہر رہنا ممکن تھا تو ہماری تخیل کی دنیا میں یہی تھے . . ۔ وقت آیا تو جس کے وجود کا جیسے مقصد ہی ہنسنا ہنسانا، لوگوں کا دل خوش کرنا تھا، خود ایک خاک کا ڈھیر تھا۔ دوسروں کے لیے سرمایۂ ماتم، سامان حسرت و غم۔

پرانوں میں کسی نے انسان کی تعریف کی تھی کہ وہ حیوان ضاحک ہے۔ عجب نہیں کہ انہیں سابقہ وقت کے کسی شوکت تھانوی ہی سے پڑا ہو۔ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی میں اپنی نظیر آپ تھے، ذہانت کا خزانہ آج کل کے محاورہ میں بے پناہ تھا۔ انشاؔ کے لیے مشہور ہے کہ جب بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک لطیفہ روز نیا سنایا کرو، تو ہمت جواب دے گئی اور پسینہ آنے لگا۔ یہ فرمائش اگر شوکت سے کی جاتی تو بے تکلف تیار ہو جاتے اور عمر چاہے سو سال کی ہو جاتی یہ ہر روز بلا ناغہ نئی ہی سناتے رہتے! اپنے صیغہ میں اتنا حاضر دماغ میں نے تو دیکھا نہیں۔

خدا جانے کتنی کتابیں، کتنے رسالے، کتنے مضمون، کتنے خاکے لکھ ڈالے اور تھکن یا ماندگی کا پتا نہیں۔ ہر وقت آمد ہی آمد، آورد جیسے ان کی طبیعت جانتی ہی نہ تھی۔ دوسروں کو جو لکھ لکھ کر بڑی فیضی اور اولوالعزمی سے دے دیتے تھے اس کا حساب الگ اور پھر آخر میں تو کئی سال سے ایک روزنامہ میں ہر روز لطائف کا کالم پوری لطافت کے ساتھ پورا کیا کرتے۔

یہ ہنسوڑ پن تمام تر بے مقصد نہ ہوتا بلکہ ریڈیائی تقریریں ہوں یا اخباری تحریریں سب میں ہلکی پھلکی تعلیم تبلیغ مشرقیت وشرافت کی ہوتی۔ بلکہ کبھی کبھی تو عین دین واخلاق کی بھی! خود بھی عقیدۃً پختہ مسلمان تھے اور اعمال کی کوتاہیوں پر نادم وشرمسار۔ آخر تھانہ بھون ہی کے تو تھے:

ے خانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

جب پہلی بار فلمی دنیا میں قدم رکھا ہے تو مجھے خط میں لکھا۔ میں ریڈیو سے گاتے گاتے اب فلم میں ناچنے بھی آگیا ہوں!

یہ اعتراف خود سیاہیوں کا دھونے والا اور رحمتوں کو اپنی طرف کھینچنے والا ہے۔

سب سے پہلے شاید ”اودھ اخبار“ (لکھنؤ) کے ادارتی عملے میں کام کیا۔ پھر لکھنؤ کے دوسرے روزانہ ”حق“ میں آگئے۔ ایک اپنا رسالہ ”کائنات“ کے نام سے نکالا۔ ”سرپنچ“ (لکھنؤ) کے بھی مدیر رہے۔ شہرت کا پہلا قدم ”سودیشی ریل“ لکھ کر اٹھایا۔ غالباً 1929ء میں اس کے بعد سے مشہور ہوتے چلے گئے۔ مرعوب نہ ”ترقی پسندی“ سے ہوئے نہ جدیدیت کے کسی اور رخ سے۔ لکھنؤ ریڈیو میں ان کا کردار ”منشی جی“ اپنا ایک مستقل مقام رکھتا تھا اور پھر جب تقسیم کے بعد ہی پاکستان منتقل ہو آئے تو لاہور ریڈیو میں ان منشی جی کی جانشینی قاضی جی کے حصے میں آئی اور دونوں کی معصومانہ دل لگیوں نے سامعین کو لٹالٹا دیا۔ تھانوی محض نام کے تھے ورنہ اسکولی تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ لڑکپن اور جوانی کا بیشتر زمانہ یہیں گزرا۔ اس لیے زبان کے لحاظ سے پورے لکھنوی تھے۔ یہاں کے محاورہ اور روزمرہ پر عبور رکھنے والے۔ یہیں کی شستہ، رواں، سلیس، نستعلیق زبان لکھنے والے۔ خدائے آموزگار لغزشوں کوتاہیوں سے درگزر فرمائے اور مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ عمر شاید قریب 55 کے پائی ہو۔ مرض آکلہ (کینسر) سا موذی نصیب ہوا۔ اس کی ناقابل بیان اذیتیں خود ہی کتنا بڑا سبب کفارہ ذنوب کا بن گئی ہوں گی۔ پھر سفر آخرت کے لیے ذی الحجہ متبرک عشرہ اول میں بھی متبرک ترین تاریخ عین یوم الحج کی پائی! یہ تاریخ کیا ملی۔ گویا غیبی بشارت مغفوریت کامل کی ہاتھ آگئی۔

ومایلقّٰھا الاذو حظ عظیم

○○

میرا رفیق

قدرت اللہ شہاب

شوکت تھانوی کے ساتھ مرحوم کا لفظ استعمال کرتے ایک عجیب ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ جس باغ و بہار شخصیت نے اپنی تحریر اور گفتار سے لاکھوں کا دل خوش کیا ہو وہ یوں دفعتاً موت کی آغوش میں سو جائے گا، اس کا ہمیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔

شوکت تھانوی نے بے شمار لوگوں کو ہنسایا ہے لیکن اس کے اپنے دکھ اندر ہی اندر ناسور بنتے گئے۔ یہاں تک کہ اس ناسور نے چپکے چپکے گھن کی طرح اس کی زندگی کو کھا لیا۔ ایسے بندوں کی بخشش کا یہی ایک نشان ہے کہ ان کی موت پر ایک زمانہ سوگوار ہوتا ہے۔ آج بھی اردو داں طبقے کا ہر فرد شوکت تھانوی کی وفات پر اشک بار ہے۔ شوکت کے اٹھ جانے سے اردو ادب کی محفل ویران ہو گئی ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ اپنے ایک محترم اور بزرگ ممبر سے محروم ہو گیا اور ذاتی طور پر میرا ایک عزیز دوست اور رفیق مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی روح کو جنت میں اسی طرح ہنستا رکھے جس طرح اس دنیا میں اس نے لاکھوں ہزاروں انسانوں کو اپنی شگفتہ تحریروں اور تقریروں سے ہنسایا۔ آمین!

○○

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ایک مہذب ظرافت نگار

قرۃ العین حیدر

مدتیں گزریں جب میں نے ''سودیشی ریل'' پڑھی تھی مگر اس کے بہت سے جملے آج تک اس طرح یاد ہیں جیسے یہ مضمون ابھی ابھی پڑھ کر ختم کیا ہو۔

بابو جی لایے نہ ہماری بات نہ آپ کی۔ بوہنی کا وقت ہے، لایے تیرہ آنے ہی دے دیجیے۔'' ٹکٹ بابو نے کہا اور ایک پرچے پر کچھ لکھ کر دے دیا۔

''ٹکٹ کہاں ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

''نئے ٹکٹ چھپنے گئے۔''

ریل چلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

''ارے صاحب جب مسافر پورے ہو جائیں گے تب ہی تو ریل چھوڑیں گے یا ایسے ہی چھوڑ دیں گے۔''

مسافر کچھا کھچ بھر گئے۔ ریل پھر بھی نہ چلی۔

''للو فائرمین کوئلہ لینے شہر گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا جلدی آجائیو اسی لیے چھٹنے میں دیر ہو رہی ہے۔'' گارڈ صاحب نے فرمایا۔

اتنے میں للو فائرمین بھاگتا ہوا آیا۔ ''اپنے باپ کا نوکر سمجھ رکھا ہے؟ سوراج کی خوشی میں شہر کی ساری دکانیں بند ہیں۔ کہیں کوئلہ نہیں ملا۔ بڑی مشکل سے ایک جگہ سے پانچ سیر لایا

ہوں۔" اس نے کوئلے کی بوری غصے سے پٹخ دی۔

یہ جملے ممکن ہے بالکل اسی طرح نہ ہوں۔ میں نے حافظے کی مدد سے لکھ دیے ہیں لیکن کتنے مضامین یا افسانے ایسے ہوں گے بچپن میں پڑھے ہوئے جن کے پورے پیراگراف یاد رہ جائیں؟

لکھنؤ میں جب ریڈیو اسٹیشن کھلا تو "بچوں کا پروگرام" بھی شروع ہوا۔ اس پروگرام کے تین کردار ایسے تھے۔ آپا جان، ان کا نوکر "بدھو" اور تیسرے ایک پوپلی سی آواز والے بزرگ "چاچا"۔

مجھے ان تینوں سے سخت عقیدت تھی اور راسخ عقیدہ یہ تھا کہ آپا جان واقعی آپا جان ہیں۔ بدھو ان کا انتہائی بے وقوف نوکر ہے (جو تتلا کر بولتا تھا اور "گڑ سوڈے" کا شوقین تھا جسے وہ "دل تھودا" کہتا تھا) جو چاچا سے مستقل جھگڑتا رہتا ہے اور "چاچا" ایک بے حد دلچسپ بڑے میاں ہیں۔

کچھ عرصے کے بعد مجھے اس پروگرام میں شرکت کے لیے بلایا گیا تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یعنی یہ کہ ہم آپا جان، بدھو اور چاچا کو نہ صرف زندہ جیتا جاگتا اور بولتا دیکھیں گے بلکہ ان کے ساتھ پروگرام میں شرکت کا فخر بھی حاصل کریں گے۔

لیکن ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر معلوم ہوا کہ آپا جان کا اصل نام تو عرش منیر ہے (یہ ایک اسٹاف آرٹسٹ تھیں۔ ان کی بے حد خوب صورت آواز تھی اور برسوں یہ لکھنؤ اسٹیشن کے ڈراموں کی "اسٹار" صداکار رہیں اور بہت عرصے سے کراچی کی ایک دور افتادہ مہاجر بستی میں بڑی تکلیف اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہی ہیں۔) بدھو کے متعلق انکشاف ہوا کہ یہ آپا جان کے نوکر قطعی نہیں ہیں بلکہ ریڈیو کے ایک رکن ہیں (یہ اب ریڈیو پاکستان کے اعلیٰ افسر ہیں اور کئی برس سے اقوام متحدہ نیویارک میں تعینات ہیں) اور چاچا کے لیے پتا چلا کہ ارے یہ تو شوکت تھانوی ہیں۔

آئندہ برسوں میں ہم بچوں کے پروگرام کے زمرے سے نکل کر "بڑوں" کے

پروگرام میں شامل ہونے لگے اور کچھ تھوڑی بہت "توں تاں" بھی شروع کر دی۔ یعنی یہ کہ عورتوں کے پروگرام کے لیے ایک آدھ "اسکٹ" تصنیف فرمایا۔ اسکول سے نکل کر کالج اور کالج سے یونیورسٹی پہنچے۔ ریڈیو اسٹیشن کی فضا وہی رہی۔ وہی سب جانے پہچانے لوگ اور مانوس، گھریلو سا ماحول، ان دنوں لکھنؤ ریڈیو کے ڈرامے خاصے کی چیز ہوتے تھے اور لاہور ریڈیو سے دوستانہ مقابلہ اور چشمک رہتی تھی کیوں کہ لاہور والوں کو بھی اپنے فن کاروں پر بہت ناز تھا۔ شاید اسی دوران میں شوکت تھانوی کسی فلم کمپنی میں مکالمے لکھنے کے لیے لاہور چلے گئے اور اس کے کچھ عرصے بعد لکھنؤ واپس آ گئے۔

غالباً اگست 47ء کی ایک شام، ریڈیو اسٹیشن اجڑا اجڑا سا لگ رہا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشن نئے نئے ریڈیو پاکستان میں شامل ہو جانے کی وجہ سے تازہ انڈین لسنر یکلخت بے حد دبلا اور مدقوق سا معلوم ہو رہا تھا۔ لکھنؤ سے سعیدہ رضا اور آل حسن پہلے ہی تبدیل ہو کر دہلی جا چکے تھے۔ بیشتر مسلمان اراکین لاہور، پشاور، ڈھاکہ اور کراچی روانہ ہو گئے تھے۔ گوہر سلطان، حفیظ جاوید اور عطیہ حبیب اللہ انگلستان جا چکی تھیں۔ وہ پرانا ماحول راتوں رات بدل سا گیا تھا۔ عرش منیر نے بتایا کہ جگل کشور مہرہ، شیخ احمد سلمان میں تبدیل ہو کر پاکستان چلے گئے۔ شمشیر سنگ بترہ بھی (شاید یہی نام تھا) سلیم شہد ہو کر لاہور گئے۔ شوکت صاحب بھی لاہور میں ہیں عنقریب اپنے گھر والوں کو وہاں بلانے والے ہیں۔

اس کے فوراً بعد ہی لاہور سے پاکستان ہمارا ہے کا پروگرام شروع ہو گیا جسے امتیاز علی تاج اور شوکت صاحب مرتب کرتے تھے۔ اس کے بعد "قاضی جی" کا سلسلہ شروع ہو کر بے حد مقبول ہوا۔

لاہور ریڈیو اسٹیشن پر شوکت صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی رہی۔ 1956ء میں ایک مرتبہ کرشنا آل حسن میرے ساتھ ریڈیو اسٹیشن گئی کیوں کہ وہ آل حسن سے شوکت صاحب سے پرانی دوستی کی وجہ سے مرحوم سے خاص طور پر ملنا چاہتی تھی۔

شوکت صاحب ریڈیو اسٹیشن کے پہلو والے کمرے میں اپنی میز پر بیٹھے تھے۔ کرشنا

سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے ان سے کہا:

”شوکت صاحب۔ آپ کا وہ ترکہ اب تک نہیں ملا، ہم لوگ بے تابی سے اس کے منتظر ہیں۔“

قصہ یہ تھا کہ چند برس قبل صدیق احمد صدیقی نے بتلایا تھا کہ شوکت صاحب کے ساتھ ایک بڑی ڈرامائی بات ہونے والی ہے، وہ یہ کہ ان کے ایک چچا انگلستان میں بس گئے تھے اور مشہور ہنٹلے اینڈ پامر بسکٹ کمپنی کے ڈائرکٹر یا مالک یا جنے کیا بہرحال بہت سخت کروڑ پتی ہو گئے تھے۔ انہوں نے لاولد وہاں انتقال کیا اور شوکت تھانوی ان کے واحد قانونی وارث ہیں اور عنقریب یہ لاکھوں پونڈ کا ورثہ حاصل کرنے کے لیے ولایت آنے والے ہیں۔ یہ واقعی اکسائیٹنگ بات تھی۔ ظاہر ہے کہ جب شوکت تھانوی ملک انگلستان کے ایک کروڑ پتی بن جائیں گے تو کلریجز یا ڈورچسٹر میں رہا کریں گے۔ ایک آدھ قلعہ وغیرہ خرید لیں گے اور ایک عدد رولس رائس تو لامحالہ رکھیں گے ہی تو ہم سب پر کیا لازم آیا؟ ہم سب پر یہ لازم آیا کہ ہم لوگ موصوف کو ابھی سے ”کلٹی ویٹ“ شروع کر دیں اور اہل ولایت پر ثابت کریں کہ شوکت تھانوی مدظلہ کے نہایت قریبی رشتے دار ہیں، تاکہ موصوف کے ڈورچسٹر اور رولس رائس کار وغیرہ سے ہم صوفی کو بھی فیض حاصل ہو سکے۔

چناں چہ میں نے شوکت صاحب سے پوچھا کہ وہ ترکہ آپ کو اب تک کیوں نہیں ملا۔ ہم لوگ آخر کب تک انتظار کریں۔ واقعی میں نے کہا: ہم مقبول انگریزی ناولوں میں پڑھا کرتے تھے کہ فلاں کا چچا آسٹریلیا میں بے اندازہ دولت چھوڑ کر مرا، یا افریقہ میں ہیرے کی کانیں اپنے کسی دور افتادہ اور گم نام بھتیجے کے نام منتقل کر کے دوسری دنیا کو سدھارا۔ آپ کے چچا نے یہ روایت سچ کر دکھائی۔

شوکت صاحب نے جواب دیا کہ بھئی اس میں ایک شاخسانہ نکل آیا۔ اس ترکے کی لندن میں ایک انگریز خاتون دعوے دار پیدا ہو گئی ہیں اور انہوں نے وصیت کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ اب میرے پاس اتنا پیسہ کہاں ہے کہ میں اتنا مہنگا مقدمہ لڑتا پھروں لہذا

میں نے اس کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

اسی وقت ن۔ م۔ راشد آ گئے۔ جو ان دنوں نیو یارک میں تعینات تھے اور رخصت پر پاکستان آئے ہوئے تھے۔ اس سے قبل میں راشد صاحب سے نہیں ملی تھی۔ شوکت صاحب نے بڑی برجستگی سے میرا تعارف کرایا۔ ''یہ ریڈیو کی بیٹی ہیں۔'' اور کرشنا کو متعارف کیا۔ ''یہ ریڈیو کی بہو ہیں۔'' (یعنی آل حسن کے رشتے سے وہ ریڈیو کی بہو تھی!)

کل کی بات ہے کہ صدیق احمد صدیقی، شوکت صاحب کے کروڑ پتی ہونے کی بشارت دے رہے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ لاہور ریڈیو اسٹیشن پر محمود نظامی نہایت جوش و خروش اور نفاست سے مارچ کا سالانہ جشن موسیقی منعقد کر رہے ہیں اور شوکت صاحب باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ادھر ادھر ٹہل رہے ہیں۔ اے لیجیے . آج نہ صدیق احمد صدیقی ہیں نہ محمود نظامی نہ شوکت تھانوی کمال ہے واقعی

مجاز کے لطیفوں جتنے تو نہیں مگر شوکت صاحب کے بھی بہت سے لطائف مشہور ہیں کہ کیسے انہوں نے انتہائی رنج والم کے موقع پر اپنے ایک جملے سے روتوں کو ہنسا دیا۔ یا کسی بے ڈھب اور نازک صورت حال کو ایک برجستہ فقرے اور بذلہ سنجی کے ذریعے خوب صورتی سے سنبھال لیا۔ لیکن اختر شیرانی، میرا جی، منٹو اور مجاز کی مانند شوکت تھانوی ایک ''روایت'' کی صورت اختیار نہ کریں گے۔ ان چاروں فن کاروں کے برعکس شوکت صاحب ایک سیدھے سادے اور گھریلو سے آدمی تھے۔ ان کے کردار میں جہاں تک میرا خیال ہے کوئی غیر معمولی پیچ و خم یا نفسیاتی الجھنیں نہ تھیں اور ایک سیدھے سادے آدمی کا ''لیجنڈ'' (Legend) یا حکایت میں تبدیل ہو جانا ذرا مشکل ہے۔ محض یہ بات کہ وہ پان کے از حد شوقین تھے۔ دیو مالا کے لیے کافی نہیں۔ دیو مالا کی تخلیق کے لیے مرحوم ادیب کو شراب یا کسی اور جان لیوا اور مہلک نشے کا عادی ہونا بھی ضروری ہے۔

شوکت تھانوی بے حد ہر دل عزیز تھے اور آج سے نہیں ''سودیشی ریل'' کے زمانے سے اب تک ان کی ہر دل عزیزی میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔ یہ مقبولیت انہیں دونوں ملکوں میں

حاصل تھی۔ آزادی کے بعد سے ہندوستان میں ان کی تصانیف کا ہندی میں ترجمہ ہوتا رہا ہے اور وہ ہندی داں طبقے میں بھی بہت مقبول تھے۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ ناول، افسانے، ڈرامے، اخبار کے کالم، ریڈیو فیچر وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ ایک ایسے محکمے سے ان کا تعلق تھا جہاں ادیب کو اخبار نویس کی مانند متواتر لکھنا اور لکھتے رہنا پڑتا تھا، لکھنا ایک عادت ثانیہ اور میکانکی عمل بن جاتا ہے۔

مگر اس زود نویسی کے باوجود شوکت صاحب کی زیادہ تر تحریریں جو وقتی موضوعات پر لکھی گئی تھیں، اپنی شگفتگی اور برجستگی کی وجہ سے پڑھنے کے لائق ہوتی تھیں۔ سوائے روزنامہ ''جنگ'' کے اس کالم کے جو انہوں نے مجید لاہوری کے انتقال کے بعد لکھنا شروع کیا تھا اور جس میں آمد کے بجائے محض آورد ہوتی تھی۔

''عظیم فن کار''، ''عظیم ناول نگار''، ''عظیم شاعر''، ''عظیم مزاح نگار'' میں اس لفظ ''عظیم'' کو بہت شک وشبے کی نظر سے دیکھتی ہوں۔ عظمت کا فیصلہ صرف تاریخ کے ہاتھ میں ہے اور یہ سوال بہت بعد کا ہے کہ ادب کی تاریخ کس لکھنے والے کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرے گی۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ برنارڈ شا مرنے کے فوراً بعد بھلا دیے گئے۔ دور کیوں جایے خود ہمارے یہاں منٹو کے سلسلے میں جوش وخروش اب مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ بہت اچھے ادیب اپنے دور کے بعد مختلف وجوہ کی بنا پر محض ''Dated'' ہو کر رہ جاتے ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی کا آج وہ غلبہ نہیں رہا جو آج سے بتیس سال قبل ''نیرنگ خیال'' کے دور میں تھا۔ وقت اور تاریخ دونوں انتہائی ظالم اور ستم پیشہ ہیں۔ وقت کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ نہ وہ خودستائی، گروہ بندی، من ترا حاجی بگویم، نئی نسل بنام پرانی نسل، سنسنی خیزی یا ''فقرہ بازی'' کے چکر میں آتا ہے۔ آپ اپنے فن کے متعلق خود کتنے ہی مقالے لکھ لیجیے، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پچاس برس کے الٹ پھیر کے بعد معلوم ہوگا کہ کس ادیب کی تخلیقات کا کتنا حصہ باقی بچ گیا اور کتنا زمانہ برد ہو گیا۔ ادبی رواجوں، تنقید کی ٹکسالوں، نظریاتی بحثوں اور وقتی مقبولیت سے بالاتر کوئی چیز ہے۔ ادیب کی اپنی صلاحیت اس کا فنی اور نظریاتی وزن اور Artistic Consistency جو

اسے زندہ رکھتی ہے اور اس کے لیے وقت کی کسوٹی درکار ہے۔

ادب کی دنیا بڑی انوکھی دنیا ہے۔ میرے نزدیک ابو تمیم فرید آبادی ایک بہت اچھے مزاح نگار ہیں۔ لیکن میں نے کسی تذکرے یا جائزے میں ان کا نام نہیں دیکھا۔ بلکہ بہت سے لوگ تو ان کی تحریروں ہی سے ناواقف ہوں گے۔ عظیم بیگ چغتائی بہت بڑے مزاح نگار تھے لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا آج وہ اتنے مقبول نہیں رہے اور بعض اوقات گم نام ادبی شخصیتوں کو ''ڈسکور'' کرلیا جاتا ہے اور فراموش شدہ فن کاروں کی ''تجدید'' بھی ہوجاتی ہے جیسا کہ مرزا رسوا اور نظیر اکبرآبادی کے ساتھ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت سی چیزیں جن کو ہم ادب عالیہ کہہ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ ان کی محض ایک دستاویزی حیثیت ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے۔ 1936ء سے پہلے کا بیشتر نثری اور افسانوی ادب خاصا نحیف تھا، لیکن شوکت تھانوی نے ''سودیشی ریل' اسی زمانے میں لکھی اور ''پطرس کے مضامین'' بھی جبھی لکھے گئے۔ لہٰذا ہم قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ کسی ایک دور میں صرف دوسرے درجے کا ادب تخلیق کیا گیا۔ ادب کے ''ترقی یافتہ'' اور ''درخشندہ'' زمانوں یا ''تنزل پذیر' اور ''کم زور'' زمانوں سے بڑے ادیب کا کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اپنا کام کرکے چلا جاتا ہے۔ بدلتے ہوئے ادبی رواج، معاشرے اور قارئین کے تبدیل شدہ تعصبات، مزاج اور مذاق، یا بعض اوقات چند نقادوں کی نظر کرم اور مبالغہ آمیز تعریف یا نقادوں کا عتاب، یا لاعلمی یا جہالت، تعصب یا بے نیازی، یہ ساری چیزیں مل کر ایک وقفے کے لیے اسی ایک ادبی شخصیت کو یا آسمان پر چڑھا دیتی ہیں یا پاتال میں گرا دیتی ہیں مگر بات وہی رہتی ہے۔ اگر اس لکھنے والے میں کوئی ''چیز'' تھی تو وہ وقت گزر جانے پر بھی زندہ رہے گا اور بھلا دیے جانے کے بعد پھر یاد کیا جائے گا۔

لہٰذا میں شوکت صاحب کے متعلق یہ حکم لگانے کا کوئی حق نہیں رکھتی کہ وہ کس قدر عظیم ظرافت نگار تھے اور کتنے بلند پایہ فن کار تھے اور ان کا مزاحی ادب زندگی کی کن اعلیٰ ترین قدروں کا حامل تھا وغیرہ وغیرہ۔ میں بحیثیت ایک قاری کے اتنا جانتی ہوں کہ زندگی کا بھرپور

احساس اور ایک لطیف اور مہذب ظرافت ان کی تحریروں میں جاری وساری تھی۔ ایک اچھے ظرافت نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ روزمرہ کے معمولی واقعات میں، زندگی کے بے تکے پن اور بدصورتی اور المیے میں صورت حالات کی شدید نامعقولیت میں لغویت کا رخ دیکھ لے اور اس پر ہنس اور ہنسا سکے۔ اچھا مزاح نگار زور سے قہقہہ نہیں لگاتا، صرف مسکراتا رہتا ہے۔ وہ پھکڑ اور سوقیانہ باتوں یا محض ضلع جگت یا چند بندھے ٹکے جملوں یا چند سٹاک مسخرے کرداروں کی تکرار سے مزاح پیدا نہیں کرتا۔ وہ زندگی کی گھمسان میں اتر کر زندگی کا مضحک پہلو تلاش کر لیتا ہے۔ اسی وجہ سے شوکت تھانوی کی تحریروں میں طنز کی تلخی یا خالص سنہرے پن کے ابتذال کے بجائے محض مزاح کی شگفتگی ملتی ہے۔ یہ فرحت بخش ظرافت نکتہ سنجی، خوش طبعی، ذہین زندہ دلی، پر مذاق اور لطیف فقروں اور الفاظ کے نفیس اور مہذب استعمال سے پیدا ہوتی ہے اور شوکت تھانوی ہمیشہ ایک مہذب ظرافت نگار رہے۔ یہی تہذیب اور متانت ہمیں رشید احمد صدیقی کے یہاں ایک بہت اونچی اور فلسفیانہ سطح پر ملتی ہے۔

شوکت تھانوی اپنی زندگی میں ایک طویل عرصے تک اپنے الفاظ اور اپنی آواز کے ذریعہ لاکھوں انسانوں کو ہنساتے رہے اور اس روتی بسورتی اعصاب زدہ دنیا میں اگر کوئی انسان اپنی فطری شگفتگی کے ذریعے دوسروں کو تھوڑی دیر کے لیے محظوظ اور بشاش کر سکے تو ہمیں اس کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

کوئی دوسرے شوکت تھانوی اب دنیا میں نہیں آئیں گے۔

○○

باغ و بہار شخصیت

حفیظ جالندھری

شوکت سے مل کر ہنستے ہم
یہ کیا خبر تھی رونا پڑے گا

شوکت تھانوی کو آج اردو کی ساری دنیائے ادب رو رہی ہے۔ شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ضاحک و ظریف، شوکت اخبارات و رسائل کا مدیر، صحیفہ نویس، لطیفہ گو شوکت بزم ادب شعر و فن کی ایک باغ و بہار شخصیت ہم سے جسمانی طور پر رخصت ہو گئی ہے۔ وہ شخصیت جو زندگی کے اذیت دہ پھوڑوں پر اپنی خوش گفتاری کا مرہم رکھا کرتی تھی۔ آج شوکت جن کو ہنسایا کرتے تھے۔ وہ سب روتے رہ گئے ہیں۔ شوکت کے رخصت ہو جانے کے بعد بزمِ یاراں کو اب سارا عالم کچھ مہیب سا نظر آ رہا ہے:

کس قدر آباد ہے دنیائے دوں
مردہ و افسردہ و خوار و زبوں
خاک کا پیوند ہونے کے لیے
صورتِ اشکِ ندامت سرنگوں

اور یہ بالکل سچ ہے۔ صورت حال اب یہی ہے کیوں کہ:

اہل دل کی زندگی ہے زندگی
روح کی تابندگی ہے زندگی
ہو گئے رخصت جہاں نور و سرور
کچھ نہیں شرمندگی ہے زندگی

شوکت تھانوی ایک کثیر الاحباب شخصیت تھے، پاکستان میں بھی اور بھارت میں بھی ان کے بے شمار ذاتی دوست موجود ہیں۔ خدا ان کو زندہ رکھے تا کہ وہ شوکت کے لطائف سے خود بھی مزید لطف حاصل کرتے رہیں اور دوسروں کو بھی ایسے ظرائف سے باخبر کریں جو ابھی تک ذاتی دوستوں ہی کو معلوم ہیں۔

ان کی تحریروں سے شگفتگی حاصل کرنے والے قدردان یا ریڈیو اور مشاعروں میں ان کی زبان سے بذلہ کے موتی چننے والے ان گنت ہیں۔ اپنے ذوق کے مطابق شوکت کی رحلت پر سب ماتم کناں ہیں۔ سب اس جدائی سے متاثر ہیں۔ سب اپنے ذہن کو تسکین کے معاملے میں اردو مزاح نگاری اور خندہ گفتاری کی فضا میں ایک خلا دیکھ رہے ہیں جو شوکت کے بعد آسانی سے پر ہوتا نظر نہیں آتا۔

ذاتی دوست احباب سے ان کے مراسم انتہائی مخلصانہ بھی تھے اور شرارت معصومانہ سے بھی بندھے ہوئے تھے۔ شوکت کی زبان پر لطیفے اور شرارتیں جو سب دوستوں کو زندہ دلی عطا کرتی تھیں، اب موت نے ان کو قبر میں دفن کر دیا ہے، شوکت کے ساتھ ہی۔

یہ محرومی کش مکش حیات کے ہر قدم پر زخم کھاتے چلے جانے والے احباب کے لیے اس مرہم کے پھاہوں سے محرومی ہے جو ہر دوست کے لیے شوکت کے پاس تیار بہ تیار رہتے تھے۔ اب روتوں بسورتوں کو ایک ہی فقرے، ایک ہی جملے سے کون ہنسا سکے گا۔

شوکت کی بذلہ سنجی۔ حاضر جوابی، لطائف وظرائف جس رنگ وڈھنگ کے تھے اب وہ دوسرے اردو بولنے والے اور لکھنے والوں میں سے شاید ہی کسی کو حاصل ہوں اس لیے کہ شوکت نے جس فضا، جس مقام اور جس دور میں آغاز حیات کیا تھا اور زندگی کی منزلیں طے

کرتے ہوئے وہ جس مقام اور جس دور پر آ پہنچے تھے، ان تمام طے کردہ راہوں کے مناظر اپنے اور اپنے اردگرد کے ماحول کی لیاقتیں بھی اور حماقتیں بھی ان کے ذہن پر مرتسم تھیں اور اب نئے مقام اور نئے ماحول پر وہ پرانی حماقتوں اور نئی حماقتوں کو یکجا کر کے بیک وقت دونوں کو آئینہ دکھانے پر قادر تھے۔ پرانا دور شوکت کے ساتھ ہی انتقال کر گیا اور نیا دور......... خدا بچائے۔

بیٹھتے اٹھتے بولتے چالتے لکھتے پڑھتے زندگی کی بلندیوں پستیوں پر اترتے چڑھتے ہر عالم میں ایک خاص خداداد لطیفہ ان سے سرزد ہوتا تھا۔ دوست ہو یا دشمن غیر ہوں یا عزیز و اقارب حتیٰ کہ اپنے بیوی بچوں تک پر فقرہ کسنے سے وہ دریغ نہیں کرتے تھے اور فقرہ بھی کیسا کہ باید و شاید!

مجھے تو کچھ ایسا نظر آیا کہ ان کے صدر و سینہ میں کوئی مقناطیس ہے نیا لطیفہ ہو یا نئی شرارت اس مقناطیس کی آڑ میں تیار ہوتی رہتی ہے۔ یہ مقناطیس بڑی بزم ہو، یا محض ایک ہی دوست کے ساتھ لطائف کی رزم، کسی نہ کسی زبان سے یہ مقناطیس ایسی باتیں کہلوا دیتا تھا۔ کوئی ایسی حرکت یہ مقناطیس دوسروں سے سرزد کرا دیتا، جس پر فوراً وہ چھپا ہوا لطیفہ شوکت کی زبان سے ٹپک کر فضا میں قہقہوں کا لالہ زار سجا دیتا تھا۔ لطیفے کے لیے غور و فکر یا اڈی ہوئی شرارت کے لیے کسی مقام اور مرحلے کی ضرورت شوکت کو نہیں تھی۔ جو بات دوسروں سے غالب رہنا چاہتی، شوکت کے لیے حاضر تھی لیکن اس کے لطیفے یا شرارت میں کبھی کوئی زہر، کبھی کسی کی دل شکنی یا دل آزاری نہ موجود تھی نہ شوکت کا مقصود!

شوکت کی ظرافت زندہ دلی تھی۔ یہ دل لگی ہوتی تھی دل کی لگی نہیں۔ لگاؤ تھا لاگ نہ تھی اس لیے جس پر وہ فقرہ کستا تھا۔ وہ روتے روتے قہقہے لگا کر ہنستا تھا۔ اس کے ذہن سے نکلے ہوئے الفاظ کے ہر ہدف کو کھلتے ہوئے صدف سے موتی ملتے تھے۔ اس کی تراوش بذلہ سے سوکھے ہوئے چمن کھلتے تھے۔ افسوس آج وہ ذہن بسند ہو گیا ہے! آہ آج وہ اپنی رنگینی بیان سے زبان کی لذت کو بے دار کرنے والا خود ہی سو گیا ہے!

جو قیامت اٹھائے پھرتے تھے
سو رہے ہیں وہ لمبیاں تانے

شوکت پرانے دور اور پرانے مقام سے چلتا ہوا جس نئے مقام اور جس نئے دور میں آ گیا تھا، ہماری طرح وہ پرانی یادوں پر بسورتا نہیں تھا۔ کیوں کہ اس دور کی حماقتوں پر ہنسنے ہنسانے کا ملکہ اسے ودیعت تھا۔ نئے ماحول کی حماقتوں اور پرانے دور کی حماقتوں کو ہم آہنگ کر لینے اور پھر دونوں تصویروں کو ایک تصویر میں بھر لینے کی لیاقت شوکت میں جس ڈھنگ سے نظر آئی دوسرے میں نہیں پائی گئی۔ رنگ برنگ قہقہوں کو ایک ہی جنبش قلم سے ہر پس منظر کے ساتھ فضائے عالم پر ثبت کر دینا شوکت کے لیے آسان تھا۔ دوسروں کے لیے محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ وہ خود لازما خوش و خرم بھی ہوں گے۔ آہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میں شوکت کے خاص الخاص حلقۂ احباب میں سے نہیں ہوں۔ خاص الخاص احباب تو واقعی ان کو بہت زیادہ جانتے ہوں گے۔ تاہم میری بھی چھتیس برس سے اچھی خاصی شناسائی کہیے یا دوستی پر محمول کیجیے۔ شوکت سے گہری صحبت رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کے قلب پر بہت سے رستے ہوئے ناسور تھے، زندگی کی ذمہ داریوں کے دو پاٹ ان کو پیسے ڈال رہے تھے۔ تاہم وہ راتوں کو بلند مرتبہ دوستوں اور مقتدر افسروں کے ہاں کھانے پر چہکائے جاتے۔ عام مشاعروں پر پے بہ پے بلائے جاتے تھے اور رات رات بھر جگائے جاتے تھے۔ مشاعروں سے رونمائی ضرور حاصل ہوتی ہوگی، لیکن چھینٹوں سے گزر اوقات بصد مشکل ہوتی تھی۔

جامہ زیب آدمی۔ وضع داری کا رسیا۔ اپنے زخم ہائے داخلی کو چھپاتا رہا اور خارجی دنیا کو اپنے انداز گفتار سے پر بہار بناتا رہا۔ معاش کے لیے شوکت کی محنت کا اندازہ شاید آپ نہیں کر سکیں گے جس پر ایسی ہی بیت رہی ہو۔ اس کے سوا کون جانتا ہے کہ یہ ہنسانے والی مشین اپنے ایندھن کے لیے کیا کیا جتن کر رہی ہے۔ اس نے بارہا مجھے، میرے استفسار پر،

اشک آلود آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے آپ بیتی سنائی تو مزاح اور ظرافت کے پیچھے شوکت کی اصل خوں چکاں صورت نظر آئی۔ ۔ ۔ !

جنگ کے زمانے میں شوکت نے میرے اسٹاف میں صوبہ متحدہ کے اندر تبلیغ مقاصد جنگ کے سلسلہ میں بطور (آرگنائزر) مہتمم بھی کام کیا تھا اور میں نے لکھنؤ میں اس کی قیام گاہ پر بھی اس کی میزبانی کے چند مرتبہ طور طریق دیکھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ دوسری شادی کرنے پر کیوں مجبور ہوا، لیکن یہ تحسین کے سوا اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ جب میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے پہلے فرزندوں کی تربیت اور پھر ان کو برسرروزگار بنانے میں کس قدر پدرانہ شفقت اور ذمہ داری اختیار کیے رکھی اور اپنی پہلی بیگم کو آخری دم تک باقاعدہ وہ جس قدر روپیہ مہیا کرتے تھے، وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ الحمدللہ ان کے دو فرزند اچھا خاصا کما رہے ہیں۔ تیسرا تعلیم کے آخری مدارج طے کر لینے کے قریب ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے مرحوم شوکت کے احساس ذمہ داری نے پہلی بیوی اور بچوں کے سلسلے میں وہ سب کچھ کیا ہے جو ایک شریف ترین مسلمان کو کرنا چاہیے تھا۔ یہ بچے سعید اور سعادت مند ہیں۔ ماشاءاللہ برسرروزگار ہیں۔ اللہ ان کو سلامت رکھ اور دن دوگنی رات چوگنی ترقی کریں۔ وہ اپنی والدہ کو تو بے نیاز کر ہی چکے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی دوسری والدہ کو بھی نہ بھولیں گے۔

آہ . دوسری بیوی جو شوکت کے بڑھاپے کا سہارا تھی۔ جس کو میں نے ایک لمحہ بھی شوکت کی خدمت سے غافل نہیں دیکھا اور اس بیوی سے تین بچیاں

شوکت کو بیماری کے عالم میں جس نے بھی دیکھا ہے وہ شاہد عادل ہے کہ اپنی موت پر تو وہ ہنستا ہی تھا بلکہ شاید عزرائیل کو بھی کوئی فقرہ چست کیے بغیر اس نے نہ چھوڑا ہوگا۔ لیکن وہ روتا تھا۔ روتا کیوں تھا۔ اس لیے کہ اس بیوی کی بے چارگی اور ان تین بچیوں کی یتیمی اس کو کھائے جا رہی تھی۔ میں نے اسی لیے اخبار "جنگ" کے ذریعے پاکستان کے اہل دل سے استدعا کی تھی مگر اللہ کریم جو سننے والا ہے اس نے سنی تو، لیکن بندے کے لیے بہتر کیا ہے جاننے والا بھی تو وہی ہے !

میر خلیل اور میر جمیل تک میری رسائی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہ دونوں بھائی جان مال ایمان کے ساتھ کوشاں رہے اور اب یتیم بیٹیوں اور ناچار بیوہ کے سلسلے میں بھی "جنگ" کے ادارے کے ساتھ شوکت سے وابستگی سے بھی بہت زیادہ شوکت کی شخصیت اور اس کی مخلصانہ رفاقت کا حق ادا کرنے میں کوئی دریغ نہیں فرما رہے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ دریغ نہیں فرمائیں گے۔ مجھ عاجز نے اور چند مجھ سے بہتر لوگوں نے رائٹرز گلڈ کے ذریعے سے بھی قدر دانیٔ شوکت کی زنجیریں ہلائی ہیں اور توقع ہے کہ زندگی میں جس نے سبھی کو بہلایا اور ہنسایا ہو، وہ شوکت کی زہرہ اور شوکت کے تین کمسن ستاروں کو رونے کے لیے نہیں چھوڑیں گے۔

باقی رہ گئے ہم آپ شوکت کی ظریفانہ تحریروں سے لطف اور لذت لینے والے۔ ان کے تازہ بہ تازہ لطائف و ظرائف سے تو اب محروم ہو گئے لیکن ہمیں چاہیے کہ ان کی شائع شدہ کتابوں کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کے لیے سعیِ بلیغ کریں اور جو مضامین ابھی تک کتابی صورت اختیار نہیں کر سکے، ان کو کتابی صورت میں لانے والوں کو توجہ دلائیں۔ کیوں کہ اہلِ قلم کی حالت تو یہی رہے گی کہ:

پگھلتی جائیں شمعیں اور جلتے جائیں پروانے
اسی کو اہلِ محفل گرمیِ محفل سمجھتے ہیں

○○

شوکت تھانوی کی یاد میں

فیض احمد فیض

فیض احمد فیض شوکت تھانوی مرحوم یکا یک محفل سے اٹھ گئے۔ اس ہمدم دیرینہ کی جدائی پر احباب کے دل پر جو گزری سو گزری، لیکن ذاتی غم سے زیادہ اس بات کا دکھ ہے کہ محفل وطن میں جہاں رلانے کو بہت کچھ ہے لیکن ہنسانے کو شوکت تھانوی تھے اور ان کی جگہ اب کون سنبھالے گا۔ برسوں سے ان کا نام تکیۂ کلام کی صورت گھر گھر ورد زبان تھا۔ یہ فقرہ، وہ لطیفہ، وہ نقل۔ ہزار جگہ ہزار بات شوکت تھانوی سے روایت تھی۔ پھر ان کے لطف صحبت پر مستزاد، آنکھ اوجھل یاد سے دور، وہ بیسیوں محفلیں، بیسیوں صورت اور طرح طرح کے بزرگ بھی تھے۔ جنہیں مرحوم اپنی شعبدہ بازی سے دم بھر کو زندہ کر لیا کرتے تھے۔ لکھنؤ کا کوئی مشاعرہ۔ پورب کے کسی رئیس کی بیٹھک۔ دلی میں کسی حکیم کا مطب۔ یہ ثاقب لکھنوی ہیں۔ یہ نوح ناروی ہیں۔ یہ احسن مارہروی ہیں۔ یہ فلاں حکیم صاحب ہیں اور یہ فلاں نواب صاحب۔ شوکت مرحوم اپنے ممدوح کی نقل نہیں اتارتے تھے۔ خود ہی بن جاتے تھے اور اس پر طرفہ یہ کہ جس صحبت کا تذکرہ کرتے اس کی فضا اس کا سماں، اس کا پورا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا یوں تھا کہ اُن کے دم سے صرف شوکت ہی ایک عالم زندہ تھا۔ اب جو وہ رخصت ہوئے تو ان اَن گنت محفلوں کا لطف بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن یہ تو ان کے گوناگوں کمالات کا بہت

چھوٹا سا جزو تھا۔ ان کی ذہین اور بوقلموں شخصیت نے جولانیٔ طبع کے لیے جو بھی میدان منتخب کیا اس میں یکساں جوہر دکھائے۔ نظم، نثر، تمثیل، افسانہ شخصیت نگاری، نامہ نویسی، ریڈیو، صحافت، بذلہ سنجی، بدیہہ گوئی ان کی طبع زبان اور قلم یکساں، ہر میدان میں یکساں طراری سے رواں رہتے۔ ان کی ظرافت میں تکلف اور آورد کو دخل نہ تھا۔ بے تکلف اور بے تکان، جیسے بولتے ویسے لکھتے۔ نہ گفتار میں ان کی طبع کو غیر حاضر پایا نہ تحریر میں بھی انہیں قلم پر زور دیتے دیکھا اور اس مشاقی کا راز ریاضت نہ تھی، ان کی خداداد ذہانت تھی جو اکتساب کی محتاج نہیں ہوتی۔

شوکت مرحوم اپنی ہم عصر دنیا کے ان محسنوں میں سے تھے جنہیں زندگی کی آسائشوں میں بہت کم حصہ ملا لیکن وہ اپنے سوا سب کے لیے فرحت اور انبساط کے اسباب بہم کرتے رہے اب جو وہ نہیں ہیں تو اپنی محرومی پر رنج ہے کہ ان کی باغ و بہار صحبت اب کبھی حاصل نہ ہو سکے گی اور اس سے زیادہ رنج ان کی محرومی پر ہے جو اس لطف سے کبھی بھی آشنا نہ ہو سکیں گے۔

افسوس تم کو میرؔ سے محبت نہیں رہی

* * *

گوہرِ مخزنِ ظرافت

کنہیا لال کپور

شوکت تھانوی مرحوم جب تک بقید حیات رہے عوام ان سے خوش اور نقاد نالاں رہے۔ موخر الذکر کو مرحوم سے طرح طرح کی شکایتیں تھیں۔ مثلاً شوکت تھانوی شوکت تھانوی کیوں ہے؟ رشید احمد صدیقی، پطرس، عظیم بیگ چغتائی یا فرحت اللہ بیگ کیوں نہیں تھے؟ شوکت تھانوی عوام میں ہر دل عزیز کیوں تھے؟ شوکت مزاح نگار ہونے کے علاوہ فلسفی کیوں نہیں تھے؟ شوکت بسیار نویس کیوں تھے؟ شوکت ایم۔اے۔علیگ یا بی۔اے کینٹب کیوں نہیں تھے؟ بلاشک یہ سب خامیاں شوکت میں تھیں لیکن اگر خدا لگتی کہی جائے تو وہ ان میں سے کسی خامی کے لیے مطلقاً ذمے دار نہیں تھے۔ اگر وہ شوکت تھانوی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھے۔ تو یہ امر ان کی خود اعتمادی اور دیانت داری پر دلالت کرتا ہے۔ آخر یہ کہاں کی تنقید ہے کہ مزاح نگار سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنی انفرادیت کو ترک کر کے اپنے کو دوسروں میں مدغم کر دے۔

خدا کا شکر ہے کہ قریب قریب سب نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ شوکت عوام میں حد درجہ مقبول تھے۔ وہ شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں یا دیدہ و دانستہ اس سے آنکھیں چرانا چاہتے ہیں کہ شوکت خواص میں بھی اتنے ہی ہر دل عزیز تھے۔ کیوں کہ روسا، عمائد اور ادبا

بھی ان کے اتنے ہی مداح تھے جتنے کہ عوام۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی ہر دل عزیزی کا خمیازہ ان کے مداحوں کو اٹھانا پڑتا تھا۔ وہ جب بھی شوکت کی تازہ تصنیف خریدتے ان کا کوئی نہ کوئی دوست اسے اٹھا کر لے جاتا۔ مجھے اس بات کا ذاتی تجربہ ہے کہ شوکت کی تصانیف دیکھ کر سب کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ بسا اوقات یوں بھی ہوا کہ میری میز پر مشہور ادبا کی تازہ ترین تصانیف پڑی ہیں ان میں دو ایک کا مصنف شوکت بھی ہے۔ میرے احباب جن میں سبھی طرح کے لوگ شامل ہیں کسی اور کتاب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے لیکن شوکت کی تازہ تخلیق پر اس طرح جھپٹتے ہیں جیسے بھوکا آدمی خوانِ نعمت پر اور ان کی اس حرکت کو دیکھ کر مجھے ان پر غصہ اور شوکت پر پیار آنے لگتا ہے اور اسی وقت فوراً مجھے ایک بھولا بسرا واقعہ یاد آجاتا ہے۔

یہ شاید 1945ء کی بات ہے۔ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور میں کافی ہاؤس میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ ایک مشہور ناشر جو اپنی بھاری بھرکم جسامت کی وجہ سے مولوی اور پہلوان کا مرکب معلوم ہوتا تھا۔ ہماری میز کے قریب آیا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے ہم تینوں سے درخواست کی: ''ہمیں کبھی بھی خدمت کا موقع دیجیے۔''

منٹو نے طنزیہ انداز میں جواب دیا:

''بس آپ شوکت تھانوی کی کتابیں ہی چھاپا کیجیے۔'' کرشن اور میں نے منٹو کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا: ''منٹو صاحب ٹھیک فرما رہے ہیں۔'' ایک لحظہ کے لیے ناشر دم بخود ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ہم تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''گستاخی معاف، ایک بات عرض کرسکتا ہوں؟''

''ہاں ہاں بڑے شوق سے۔''

''آپ اپنے کو عظیم ادیب سمجھتے ہیں اور شاید عوام کے علم بردار بھی۔ لیکن معاف کیجیے گا آپ کی تصنیفات عوام نہیں خریدتے۔ کالج کے چھوکرے اور چھوکریاں خریدتی ہیں۔ لیکن وہ تو عوام میں سے نہیں ہیں۔ ادھر شوکت تھانوی کی تخلیقات کا یہ حال ہے کہ ہم صرف اس کی نئی

کتاب کے نام کا اعلان کرتے ہیں کہ پانچ ہزار جلدیں بک ہو جاتی ہیں۔ حالاں کہ آپ کی کسی کتاب کا ایڈیشن ایک ہزار سے تجاوز نہیں کرتا۔ شوکت تھانوی کچھ بھی ہوں۔ عوام کے ادیب ہیں۔ وہ عوام کے لیے لکھتے ہیں...... اچھا السلام علیکم۔"

وہ کافی ہاؤس سے باہر چلا گیا اور ہم تینوں پر گویا برف گر گئی۔ دل ہی دل میں ہمیں شدید خفت کا احساس ہوا۔ کیوں کہ اس کی بات صداقت پر مبنی تھی۔ شوکت کو عوام سے اور عوام کو شوکت سے والہانہ عشق تھا۔ وہ صحیح معنوں میں عوامی ادیب تھے اور ہم جو بزعم خویش اپنے کو عوام کا حامی سمجھتے تھے۔ ان سے اتنے ہی دور تھے جتنا کفر ایمان سے ہوتا ہے۔

شوکت کی یہی خوبی کچھ نقادوں کے نزدیک ان کی سب سے بڑی خامی ہے۔ میری رائے میں عوام کے لیے لکھنا جرم ہے نہ گناہ۔ آج تمام اشتراکی ممالک میں عوام کے لیے لکھنا باعث فخر خیال کیا جاتا ہے۔ استالین نے ایک بار ادبا سے خطاب کرتے وقت ایک یونانی دیو کی مثال دی تھی جسے کوئی شخص اس وقت تک پچھاڑ نہیں سکتا تھا جب تک اس کے پاؤں زمین کو چھوتے رہتے آخر ایک پہلوان نے اسے ہوا میں اچھالا اور اس پر کاری وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ استالین نے اس کہانی سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا تھا:

"یاد رکھیے۔ وہ ادیب کبھی فنا نہیں ہو سکتا جس کے پاؤں زمین کو چھوتے رہیں گے۔"

شوکت تھانوی خدانخواستہ اشتراکی ادیب تو نہیں تھے لیکن انہوں نے ہمیشہ زمین سے اپنا رابطہ قائم رکھا اور یہی وجہ ہے کہ نقادوں کی کڑی تنقید کے باوجود زندہ رہے اور اپنی زندگی میں زندہ جاوید بھی ہو گئے۔

کچھ نقادوں کو شکوہ تھا کہ شوکت کی ذہنیت خام تھی۔ ان کا شعور ناپختہ تھا۔ وہ دوسرے یا تیسرے درجے کی چیز میں لکھا کرتے تھے۔ مجھے اس رائے سے بھی اتفاق نہیں۔ جو شخص اتنا کچھ لکھے چاہے وہ ٹیگور ہو، منشی پریم چند یا اقبال ہو ہمیشہ اعلیٰ پائے کے ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ ٹیگور کو ہی لے لیجیے۔ آپ کو اس کے کلیات میں ایسی چیزیں مل جائیں گی جنہیں پڑھ کر

آپ کا سر ندامت سے جھک جائے گا۔ خود ٹیگور نے اپنی مشہور عالم تصنیف "گیتا نجلی" کے بارے میں کہ جس پر اسے نوبل پرائز ملا لکھا ہے:

''میں یہ نظمیں رات کے وقت چھپ کر لکھا کرتا تھا۔ کیوں کہ ان میں ادبیت کا فقدان تھا۔ انہیں لکھتے وقت مجھے یہی ڈر لگا رہتا تھا کہ کسی نے آ کے دیکھ لیا تو۔''

اس میں مطلقاً شک نہیں کہ شوکت نے دوسرے یا تیسرے درجے کی چیزیں بھی لکھی ہیں۔ بعض اوقات بھلے چنگے مضامین میں فرسودہ یا عامیانہ اشعار بھی نقل کیے ہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ انہوں نے اعلیٰ قسم کے ادب کی بھی تخلیق کی ہے۔ میرے اس دعویٰ کے ثبوت میں ''مضامین شوکت''، ''شیش محل''، ''بار خاطر'' اور ''قاعدہ بے قاعدہ'' پیش کی جا سکتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے ''شیش محل'' پہلی بار پڑھی تو میری ملاقات ایک نئے شوکت سے ہوئی۔ ایسا شوکت جو محض ایک فقرے کے شیشے میں پری اتار سکتا تھا اور جس کے اسلوب بیان کے ایجاز و اختصار کا یہ عالم تھا کہ اس کا ایک ایک جملہ دوسروں کے پورے مضامین پر بھاری تھا۔ کوزے میں دریا کو بند کرنے کی بہتوں نے کوشش کی ہے۔ کہیں یا تو انہیں کوزہ میسر نہیں آیا یا وہ ''ذرا سی آبجو'' کو ''بحر بے کراں'' کے ساتھ خلط ملط کرتے رہے۔ اس محاورے کو عملی جامہ پہنانے کی سعادت صرف شوکت کے حصے میں آئی اور ان کے قلم سے اتنے خوب صورت پھول جھڑے جن کی تازگی اور رعنائی ابد الآباد تک قائم رہے گی۔ ''بار خاطر'' شوکت کا شاہ کار ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر وہ اس کو لکھنے کے بعد اپنا قلم توڑ دیتے تو بھی محض اس تصنیف کی بدولت ان کا نام زندہ رہتا۔ ''بار خاطر'' سے زیادہ کامیاب تحریف ابھی تک نہیں لکھی گئی اور نہ مستقبل قریب میں اس کے لکھے جانے کا امکان ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شوکت کے طنز و مزاح میں شائستگی یا گہرائی نہیں، انہیں چاہیے ''بار خاطر'' کا بار بار مطالعہ کریں۔

عموماً دیکھا گیا ہے کبھی کبھی ایک اچھا مضمون مصنف کے حق میں رحمت کی بجائے زحمت ثابت ہوتا ہے۔ اسی قسم کا سانحہ شوکت کے ساتھ بھی پیش آیا۔ انہوں نے ایک مضمون

بعنوان ''سودیشی ریل'' لکھا اور ''سودیشی ریل'' والے شوکت کے لقب سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔ اس مضمون کے بعد انہوں نے سینکڑوں کامیاب مضامین لکھے جنھیں بیشتر نقادوں نے اس بنا پر پڑھنے سے انکار کر دیا کہ ''سودیشی ریل'' سے بھلا بہتر مضمون اب شوکت صاحب کیا لکھیں گے۔ ایمان کی تو یہ ہے کہ ''سودیشی ریل'' ان کی ابتدا تھی نہ کہ انتہا۔ میں ایسے نقادوں کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے ''سودیشی ریل'' بھی نہیں پڑھا لیکن جو اس امر کے باوجود یہ فتویٰ صادر کرنے کو تیار ہیں کہ شوکت کا مزاح سطحی ہے۔ تنقیدی سطحی پن کی اس سے بدتر مثال مشکل سے ملے گی۔

اور پھر وہ نقاد ہیں جو تنہائی میں شوکت کے مضامین مزے لے لے کر پڑھتے ہیں لیکن کھلے بندوں اس کی مذمت کرتے ہیں کیوں کہ ایسا کرنا فیشن میں داخل ہے۔ ان لوگوں پر یہ شعر صادق آتا ہے:

جنابِ شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا
مزہ بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوش گوار نہیں

شوکت صاحب تعریف و تنقیص سے بے نیاز تھے۔ میں نے انہیں کبھی کسی نقاد کی شکایت کرتے نہیں سنا۔ وہ جانتے تھے کہ سب سے بڑا نقاد وقت ہے اور اگر وہ ان کے مضامین پر سبحان اللہ کے ڈونگرے برسا رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آنے والی نسلیں انہیں فراموش کر سکیں گی۔ انہیں نہ کرم کی خواہش تھی نہ ستم کا شکوہ، فطرتاً وہ ظریف اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے اور انہیں خیال واقعہ یا کردار سے مزاح پیدا کرنے کے فن میں قابلِ رشک مہارت حاصل تھی۔ چوں کہ انہوں نے کسی مغربی ادیب کا تتبع نہیں کیا اس لیے ان کی ظرافت کے تیور سو فی صد مشرقی تھے۔ ان کے تمسخر کا طرۂ امتیاز دل جوئی تھا۔ دل شکنی نہیں، وہ نہ کسی ازم (ISM) سے تعلق رکھتے تھے اور نہ انہوں نے اپنے طنز و مزاح کو اصلاح و تربیت کا ذریعہ بنایا۔ ان کی زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے ہنسانا تھا۔ وہ مجسم ''اودھ پنچ'' تھے اور شاید اسی لیے ''اودھ پنچ'' کی شان میں کہا گیا اکبر الہ آبادی کا

قصیدہ مدحیہ شوکت کا بہترین مرثیہ ہے:

اے گوہرِ مخزنِ ظرافت
ے جوہرِ معدنِ لطافت
سرمایۂ انبساطِ خاطر
تسکینِ دل و نشاطِ خاطر
دیباچۂ دفترِ فصاحت
عنوانِ صحیفۂ بلاغت
رنگینی میں غیرتِ گلستاں
شوخی میں حریفِ برقِ تاباں
معقول مزاح ہے تو یہ ہے
شرعاً مباح ہے تو یہ ہے
ہے خلقِ خدا قتیل اس کی
حاسد کا حد دلیل اس کی
ہر کس کہ بدید گفت خوب است
باللہ مفرح القلوب است

○○

میرا بھیا

خاتون ارشد

میرا بیرن بچپن ہی سے ذہین تھا۔ عجیب عجیب حرکتیں سوجھتیں وہ بھی ایسی جن سے دوسرے لوگ بجائے خفا ہونے کے ہنسنا شروع کر دیتے۔ میں جتنا اسے چاہتی تھی اتنا ہی وہ مجھے ستاتا اور تنگ کرتا۔ میں بھی اس کی شرارتوں کا بھانڈا پھوڑتی رہتی۔ ہماری ایک تائی اماں تھیں۔ بے چاری کانوں سے بہری اور عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے کچھ کچھ سنکی ہوئی سی سیدھی سادی تو وہ شروع ہی سے تھیں۔ ہمارے تائے اب جن کو ہم بابوابا کہتے تھے مدت ہوئی ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے اور 25-30 برس سے لندن میں مقیم تھے۔ اس فراق نے تائی اماں کی دماغی حالت خراب کر دی۔ پھر بھی وہ ان کی واپسی کی لو لگائے بیٹھی تھیں۔ محمد عمر یعنی شوکت کی عمر کوئی 11 سال کی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ماموں زاد چھوٹے بھائیوں کو آمادہ کیا کہ اندر جا کر کہو کہ بابوابا آ گئے اور خود سوٹ پہن کر ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ مغرب کا وقت تھا کچھ اندھیرا ہو چلا تھا تائی اماں بے چاری کو یقین آ گیا کہ سچ مچ ان کے میاں آ گئے اور خوش خوش پیٹھ کر کے بیٹھ گئیں اور سر پر سے دوپٹہ ماتھے پر جھکا کر گھونگھٹ کی طرح کر لیا۔ کچھ منٹ انتظار کرنے کے بعد گردن موڑ کر کن انکھیوں سے دیکھا تو بھتیجے کو دیکھ کر پیٹھ پر دوہتڑ مارا کہ مجھ کو بنانے چلا ہے۔

اسی طرح ایک دن ایک کاغذ پر کچھ خانے بنائے اور اس میں کچھ ہندسے لکھے اور تعویذ کی طرح موڑ کر ان کے تکیہ میں رکھ دیے۔ جب دوسرے دن دھوبی کو کپڑے دیے جانے لگے اور تکیہ کا غلاف اتارا گیا تو وہ تعویذ نکلا۔ تائی اماں بے چاری پرانے زمانے کی عورت تھیں تعویذ گنڈوں اور جادو، ٹونے کی بہت معتقد تھیں، بدحواس ہو کر رونے لگیں کہ کسی نے میرے اوپر سفلی عمل کیا ہے۔ اب مجھ پر کچھ بن جائے گی۔ میری اماں ان کی دیورانی تھیں اور ان کی پوزیشن بہت نازک تھی۔ اس لیے کہ وہی ان کو ساتھ رکھے تھیں اور کفالت کرتی تھیں وہ پریشان ہو گئیں کہ کہیں ان کو یہ بدگمانی نہ ہو جائے کہ میرا بوجھ ٹالنے کے لیے دیورانی نے تعویذ گنڈے کیے ہیں۔ ان کو پریشان دیکھ کر میں نے کہا ہو نہ ہو یہ حرکت محمد عمر کی ہے۔ ماموں زاد بھائی جو ان کے شریک تھے وہ کیوں بتاتے۔ تائی اماں کو میں نے سمجھایا مگر ان کے پاس تو یہ تعویذ دستاویزی ثبوت موجود تھا۔ میں نے اسے لے کر دیکھا اور فوراً کہا ارے یہ تعویذ تو سلمان الارشد کے لیے ماموں لائے تھے (سلمان الارشد میرا بڑا لڑکا اس وقت شیر خوار تھا) یہ میں کہیں رکھ کر بھول گئی تھی پھر ان کے سامنے کپڑے میں باندھ کر سلمان کے گلے میں ڈال دیا۔ تب جا کر تائی اماں کو سکون ہوا۔ اب بھیا کی گوشمالی بھی کرنا تھی۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال چھوٹا تھا۔ میں جتنا چاہتی تھی اتنا ہی ڈانٹتی بھی رہتی تھی۔ علاحدہ لے کر خوب پھٹکارا اور کہا کہ اگر ابا کو خبر ہو گئی تو خوب پٹائی ہو گی۔ ان حضرت کو بچپن ہی سے صاحب بہادر بننے کا بہت شوق تھا۔ اماں ابا سے اور تو سب ضدیں پوری کرا لیتا تھا مگر والد صاحب (منشی صدیق احمد) اس شوق پر کہتے تھے کہ جب تک تم میٹرک نہیں کر لو گے سوٹ نہیں پہن سکتے۔

15 سال کی عمر میں یہ میرے پاس اچھاور آئے۔ یہ ریاست بھوپال کا ایک بڑا تھانہ تھا اور میرے شوہر (ارشد تھانوی) جو شوکت کے چچازاد بڑے بھائی ہیں وہاں سب انسپکٹر تھے۔ شوکت نے ان سے کہا کہ بھائی جان میرے لیے ایک سوٹ سلوا دیجیے۔ ارشد صاحب خود ابا سے ڈرتے تھے۔ کہنے لگے چچی جان خفا ہوں گے کہ ننھے ننھے شوق قبل از وقت پورے کرتے ہو لیکن میری سفارش پر انہوں نے سوٹ بھی تیار کرا دیا اور میرے کہنے پر ہیٹ بھی

منگادی۔ بھیا بہت خوش ہوئے ان کے بھائی جان (ارشد تھانوی) ان کو گھوڑے کی سواری بھی سکھایا کرتے تھے۔ آدمی لگام پکڑے ساتھ رہتا تھا۔ پھر بھی شوکت اس سے کتراتے تھے۔ مگر سوٹ پہن کر ہیٹ لگانے کے بعد خود ہی سائیس سے جا کر گھوڑا تیار کرایا اور سوار ہو کر قصبہ میں گھومے۔ واپس آئے تو مجھ سے کہا کہ باجی دیہاتی عورتیں مجھے گھوڑے پر آتے دیکھ کر گھبرا گئیں اور ایک دوسرے سے کہنے لگیں ہٹو ہٹو صاحبوا آرہا ہے۔ میں جانتی تھی۔ یہ بات غلط ہے۔ نواح بھوپال میں صاحبوا کوئی نہیں کہتا یہ پوربی بولی ہے، مگر اپنے بھیا کا دل رکھنے کو میں نے کہا، تم مجھے بھی تو صاحبوا معلوم ہوتے ہو۔

ایک روز ان کے بھائی جان نے کہا کہ صاحب لوگ شیر کا شکار بھی کرتے ہیں تم صاحب تو ہو گئے ہو مگر بہادر نہیں بنے آؤ تمہیں بندوق چلانا سکھائیں پھر تم صاحب بہادر بن جاؤ گے۔ تھانہ کے پیچھے ایک میدان تھا وہاں لے جا کر اپنے آگے بٹھایا اور بندوق ہاتھ میں لے کر شوکت سے چلوادی۔ اس کا ایک ہلکا جھٹکا کندھے کے قریب چھاتی پر لگا بندوق پھینک کر دوڑ کر گھر میں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ بھائی جان سے کہہ دیجیے کہ میں صرف صاحب رہنا چاہتا ہوں صاحب بہادر بننا نہیں چاہتا۔ پھر کبھی بندوق کی مشق نہیں کی اور گھوڑے پر بیٹھنا بھی چھوڑ دیا۔ یہ 1919ء کا ذکر ہے۔

1926ء کا ذکر ہے۔ شوکت میرے پاس پیکلون آئے۔ یہ ریاست بھوپال کی ایک دور افتادہ تحصیل ہے۔ ارشد صاحب وہاں تحصیل دار بھی تھے اور مجسٹریٹ پرگنہ بھی۔ اتفاق سے تحصیل کی عمارت کی مرمت ہو رہی تھی اور ارشد صاحب سکونتی مکان کی بیرونی حصے میں اجلاس کیا کرتے تھے شوکت وہاں جا کر بیٹھ جاتے تھے اور مقدمات کی کارروائی دیکھتے۔ ایک دن ایک ہندو عورت کا بیان لیا گیا اس کو سن کر عورت نے ہندی میں تیزی سے دستخط کر دیے۔ شوکت یہ دیکھ کر تیزی سے اندر آئے اور مجھ سے کہنے لگے باجی کمال ہے۔ یہاں کے دیہات کی عورتیں بھی انگریزی جانتی ہیں۔ شوکت نے دور سے یہ دیکھا تھا کہ عورت نے بائیں سے دائیں کو قلم چلایا۔ انگریزی اور ہندی کی تحریر بھی اسی رخ سے ہوتی ہے۔ وہ اس کو انگریزی سمجھا۔ جب رات کو کھانے پر ارشد صاحب سے اس کا ذکر ہوا تو انہوں نے اس غلط فہمی کو باقی

رکھا اور شوکت کو جو اسکول میں زیر تعلیم تھے کہا جب تم روانی سے انگریزی لکھنے لگو گے اور فر فر انگریزی بولنے لگو گے تو پیکلون کی کسی انگریزی داں لڑکی سے تمہاری شادی کر دیں گے۔ اس وقت تو شوکت کچھ سوچ کر چپ رہے اور بعد میں ہم ان کو چڑاتے رہے۔

لکھنؤ میں جب یہ خبر پہنچی تو گھر میں سب نے ان کو چھیڑنا شروع کر دیا یہاں تک کہ لفظ پیکلون اس سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ یہ تو ان کے لڑکپن کی باتیں ہیں، جوانی میں بھی ان کی شرارتیں پوری دلچسپی کے ساتھ جاری رہیں۔ بھوپال کے مسلمان حلوائیوں کا قلاقند ان کو بہت پسند تھا۔ جب وہ یوپی کے سانگ پبلسٹی آفیسر تھے۔ میں لکھنؤ گئی تو ان کے لیے بھوپال کا قلاقند بھی لیتی گئی۔ میرے خالہ زاد بھائی مولوی محمد عثمان صاحب سے ارشد صاحب کی بہت دوستی تھی۔ ان کے لیے بھی قلاقند لے لیا تھا جب لکھنؤ میں قلاقند گھر میں دیا گیا تو بھائی عثمان کا حصہ الگ کر کے باقی خرچ کر دیا۔ ارشد صاحب نے شوکت سے کہا کہ دیکھو تم بھائی عثمان کے حصہ میں سے نہ چرانا۔ اس پر شوکت نے کہا کہ آپ کو بھروسہ نہیں تو بھائی عثمان کے حصے کے ٹکڑے گن کر رکھ دیجیے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا جب دوسرے روز رات کو کھانا کھانے بیٹھے تو شوکت نے کہا کہ دسترخوان پر کچھ میٹھی چیز بھی تو ہونا چاہیے۔ پھر خود ہی کافی مقدار میں قلاقند لا کر رکھ دیا۔ ارشد صاحب نے اسے دیکھ کر کہا کہ گھر کا قلاقند تو ختم ہو چکا تھا۔ تم نے ضرور بھائی عثمان والا قلاقند چرایا ہے۔ شوکت نے جواب دیا کہ آپ اپنے قلاقند کے ٹکڑے دیکھ کر گن لیجیے۔ الماری کھولی تو ٹکڑے تعداد میں پورے نکلے، مگر میں سمجھ گئی اور اسے اٹھا کر دیکھا تو اس کی موٹائی کم تھی۔ جناب سانگ پبلسٹی آفیسر صاحب نے رات کو کسی وقت اٹھ کر نیچے سے آدھے آدھے ٹکڑے چاقو سے تراش لیے تھے۔ راز فاش ہونے پر شوکت بولے۔ یہ آج کل کی بہن ہیں کہ بھائی کی پردہ پوشی کرنے کے بجائے اس کو مجرم بناتی ہیں۔

اس سے بھی زیادہ مزے دار بات یہ ہے کہ ارشد صاحب لکھنؤ سے بھوپال سندیلہ کے لڈو لے کر آئے۔ یہ لڈو بطور تحفے کے دور دور کے شہروں تک جاتے ہیں اور کوری ہانڈیوں میں رکھ کر فروخت کیا جاتا ہے۔ ہانڈیوں کی تہ پر لال کپڑا رکھ کر ڈوری سے باندھ کر گرہ پر لاکھ کی

مہر لگا دی جاتی ہے۔ بھوپال آ کر دو خرچ ہوئی تھیں کہ 3-4 دن بعد نواب صاحب کی جشن سال گرہ میں شرکت کی غرض سے شوکت بھی آ گئے۔ گھر میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ ارشد صاحب نے کہا کہ تیسری ہانڈی بھی کھولو۔ شوکت جلدی سے بولے میں اس میں سے لڈو کھا چکا ہوں۔ میں نے حیران ہو کر کہا کہ یہ تو سر بمہر ہے اور لکھنؤ سے جیسی لائی ہوں ویسی ہی رکھی ہے کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ شوکت نے کہا اچھا آپ کو یقین نہیں آتا تو کھول کر گن کر دیکھ لیجیے کہ ان کی تعداد پوری ہے یا کم ہے۔ میں نے مہر دیکھی لگی ہوئی تھی۔ ہانڈی کھولی گئی اور گننے لگے تو مقرر تعداد سے واقعی دو کم تھے۔ اب سب کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیا جادو کیا ہے۔ آخر ان ہی جادوگر صاحب نے بتایا کہ لکھنؤ میں جب یہ ہانڈیاں خریدی گئی تھیں اور روانگی سے ایک دن پہلے گھر میں رکھ دی تھیں تو میں نے آدھی رات کو اٹھ کر ہر ہانڈی میں سے دو دو لڈو نکالے اور پھر دفتر میں نیچے سے اپنی مہر لاکھ لا کر لگا دی۔ اب آپ کو تو سربہ مہر ملیں کیسے شبہ ہوتا اس پر ہم لوگ ہنسنے لگے کہ ماشاءاللہ بھیا کو چوری کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ حالاں کہ کہ مقصد قلاقند یا لڈو کھانا نہیں ہوتا تھا بلکہ سب کو حیرت میں ڈالنے کے لیے اس قسم کی حرکتیں ہوتی تھیں۔ بعض دفعہ مجھ کو بھی جوابی حرکتیں کرنا پڑتی تھیں۔ جیسا کہ ایک دفعہ ہوا۔

جب وہ لاہور پنچولی آرٹ پکچر میں ڈرامہ نویس ہو کر آ گئے تھے تو ان کے ساتھ بھی ڈرامہ کیا گیا۔ یہ واقعہ فروری 1947ء کا ہے۔ میں کسی ضرورت سے لکھنؤ گئی وہاں میرا لڑکا عمران الارشد پڑھتا تھا وہاں جا کر معلوم ہوا کہ شوکت دلہن میری بھاوج بھی اپنی بیمار بہن کو دیکھنے آئی ہوئی ہیں اور شوکت کی طلبی پر جلد لاہور واپس جا رہی ہیں۔ میں اس اتفاقیہ ملاقات پر خوش بھی ہوئی اور جب سنا کہ دوسرے دن لاہور جا رہی ہیں تو غمگین بھی کہ میں آئی اور تم جا رہی ہو۔ انہوں نے کہا کہ آپ بھی لاہور چلیے بھائی سے مل کر چلی جایئے گا۔ میں نے کہا صرف ایک ہفتہ کے لیے آئی ہوں۔ چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر زیادہ دن کیسے لگا دوں لاہور جاؤں گی تو شوکت جلدی سے واپس نہیں آنے دے گا۔ ان کا اصرار بڑھا۔ دل میرا بھی بھائی کو دیکھنے کو تڑپ رہا تھا۔ عمران الارشد (میرا لڑکا) نے کہا جایئے میں بھوپال ابا کو لکھے دیتا ہوں کہ ماموں جان کو دیکھنے لاہور چلی گئیں۔ میں تیار ہو گئی اور سعیدہ شوکت دلہن اور بابا میاں (رشید عمر) کے ہمراہ

لاہور کے لیے روانہ ہو گئی۔ ریل میں ہم نند بھاوج نے ایک پروگرام بنایا اور بابا کو بھی جو چھوٹا تھا پیار محبت سے سمجھا لیا کہ ابا کو نہ بتانا کہ پھوپھی اماں آئی ہیں۔ میں نے کہا کہ شوکت بہت تنگ کرتا ہے۔ اب کی اس کو بھی ستانا ہے جب لاہور اسٹیشن قریب آیا تو برقع کی نقاب اچھی طرح ڈالی۔ جب لاہور کا اسٹیشن آ گیا تو شوکت اور منجھلا لڑکا خورشید اسٹیشن پر لینے آئے۔ ڈبے میں سے متعدد خواتین اتریں ان کے ساتھ میں بھی اتری اور چند قدم فاصلے سے دوسری عورتوں کے ساتھ گیٹ تک آئی بس ایک غلطی ہوئی کہ میرا ٹکٹ بھی سعیدہ شوکت دلہن کے ہاتھ میں تھا۔ جب وہ ٹکٹ دے کر گیٹ سے نکلنے لگیں تو شوکت نے کہا کہ یہ دو ٹکٹ کیسے گھبرا تو گئیں کہ راز نہ کھل جائے مگر سنبھل کر کہا ایک بیوی میرے ساتھ آئی ہیں اس کے ساتھ کوئی نہیں ہے یہ ان کا ٹکٹ ہے۔ میں نے جب یہ سن لیا تو پھر ساتھ ساتھ چلنے لگی جب تانگہ کیا جانے لگا تو بھاوج نے کہا تین کر لو ان کا سامان بھی ہے اور جب سب بیٹھنے لگے تو میں کھٹ سے بھاوج کے برابر بیٹھ گئی وہاں شوکت خود بیٹھنا چاہتے تھے۔ برا لگا مگر دوسرے تانگہ میں بیٹھ گئے بابا کو بلا کر بٹھانا چاہا تو ہم نے اس ڈر سے کہ یہ ناٹک جو ہو رہا ہے بچہ گڑبڑ نہ کر دے اپنے پاس ہی بیٹھا رہنے دیا۔ شوکت چیں بہ جبیں ہو رہے تھے کہ بیوی نے ایک غیر عورت کو اپنے پاس بٹھایا بچہ کو بھی نہ آنے دیا اور میں دل میں خوش ہو رہی تھی کہ بہت دوسروں کو بے وقوف بنا کر خوش ہوتا ہے آج میں بھی خوب تنگ کروں گی۔ حضرت کے تیور بدلے ہوئے تھے اور ہم دونوں کو ہنسی آ رہی تھی۔

شوکت دوسرے تانگہ میں پنچولی کی طرف چل دیے اور ہم لوگ سیدھے گھر گئے اور خورشید نے تانگہ سے اترتے ہی کہا۔ امی جان ایک تانگہ واپس نہ کروں میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ آپ کو ماڈل ٹاؤن بھی پہنچنا ہے (سعیدہ نے رستے میں کہا تھا یہ ماڈل ٹاؤن جائیں گی) شوکت دلہن بولیں نہیں بھائی اشارہ سے کہا چائے وغیرہ سے فارغ کر کے پھر لے کر جانا۔ خورشید کو بہت ناگوار گزر رہا تھا کہ ماں کو تو دیکھو کیا ہو گیا ہے۔ خورشید نے گھر میں جب سب آ کے سامان اتروایا تو اکیلے میں ماں سے کہا آپ کو معلوم ہے ابا ناخوش ہو رہے ہیں ای لیے سیدھے گھر میں نہیں آئے کہہ رہے تھے تمہاری ماں بھی کیا عذاب ساتھ لگا لیتی ہیں اور

پھر اس عورت کے چپک گئی ہیں۔ میں جاتا ہوں جب یہ محترمہ چلی جائیں جب بلا لینا۔ شوکت دلہن نے کہا کہ بیٹا بری بات ہے اس بے چاری کے ساتھ کوئی نہیں آیا نہ اسٹیشن لینے کوئی آیا۔ اب کھانا کھا کر اطمینان سے پہنچا آنا۔ میں اس وقت بیڈروم میں چلی گئی تھی اور شوکت کی آمد کے انتظار میں برقع اوڑھے بیٹھی تھی کہ کوئی دیکھ نہ لے اور بھانڈہ پھوٹ جائے۔ خورشید نے کہا امی جان آپ نے غضب کیا ابا آ کر وہاں جائیں گے کپڑے تبدیل کریں گے وہاں کیوں بٹھا دیا۔ دوسرے کمرے میں بھیج دیجیے۔ یہاں شدومد سے شوکت کی آمد کا انتظار تھا جب آدمی بلانے گیا تو کہا وہ بلا گئی یا ابھی ہے؟ خیر ہے گھر آئے تو بیوی نے کہا آپ رستہ میں رک کیوں گئے تھے۔ اشارہ سے بیوی سے پوچھا وہ گئی۔

میں نے سوچا کہ کہیں پھر گھر سے نہ حضرت چل دیں اب کھیل ختم کرنا چاہیے۔ میں نے پیچھے سے آ کر دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے مگر چشمہ لگا تھا مضبوطی سے آنکھیں نہیں بند کر سکی تھی پلٹ کر مجھ کو دیکھا تو دیوانہ وار لپٹ گیا ارے میری باجی تم کہاں سے ہاتھ لگ گئیں مجھ کو اتنا پریشان کرنے میں تم کو کیا ملا۔ بیوی سے کہا اتنی کوفت دی ہے دل چاہتا ہے اس عورت کا برقع نوچ لوں اور نکال دوں، ہم دونوں نے کہا کیا ہوتا ایسا تو پھر تم کامیاب ہوتے ہماری اسکیم فیل ہو جاتی۔ بہت یہاں سب کو ستانے ہیں آج پتا چلا دوسروں کو کتنی کوفت ہوتی ہے تم کو مزہ آتا ہے۔

بیوی سے کہا اتنی کوفت تم نے دی انہوں نے کہا ایک تو آپ کی بہن کو لے آئے اور آپ کو غصہ آ رہا تھا۔ کہنے لگے پتا بھی ہو کہ میری باجی آ گئی بلکہ میرا تو غصے کے مارے برا حال تھا اچھا ہوا ورنہ اب اور تم لوگ تنگ کرتے تو بغیر کھانا کھائے چلا جاتا کہ اب اس بلا کو گھر میں رکھے رہو جب چلی جائے گی تب آؤں گا۔ اس پر میں نے کہا آج ہی جاتی ہوں مجھ کو سوار کر دو کہنے لگے جی ہاں جتنا مجھ کو تنگ کیا اتنا ہی تنگ کر کے جانے دوں گا۔ میں نے کہا اچھا اب سنو کہ راستہ میں یہ سب پروگرام بنایا ورنہ مجھ سے کہاں ضبط ہو رہا تھا۔ کہنے لگے جی ہاں جبھی تو تنگ کیا ہے ورنہ ہمیشہ دوڑ کر لپٹ جاتی تھیں۔ اب آسانی سے تھوڑی جانے دوں گا نہ بدلہ لیا ہو تو شوکت نام نہیں اب ایک سال رہنا پڑے گا۔ میں نے کہا نہ بھیا چھوٹے

چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر آئی ہوں۔ کہنے لگے آج ہی بھائی جان کو لکھتا ہوں کہ ہمارے یہاں جب تک دولہا لینے نہ آئے لڑکی بھیجی نہیں جاتی۔ سچ کہتا ہوں جب تک لینے نہ آئیں گے نہیں بھیجوں گا اور یہی کیا کہ ارشد صاحب کا جب بلانے کا خط آتا کہ لڑکیاں گھبرا رہی ہیں یہاں سے خط جاتا خود آ کر لے جایے، ورنہ نہیں بھیج سکتے۔ ہماری لڑکی کو تکلیف ہے ہم نے میکہ میں بیٹھا لیا ہے۔

غرض ارشد صاحب کو آنا پڑا بجائے 10 دن کے 25 روز روکے رکھا، روز بستر بندھتا مزے دار ناشتہ تیار ہوتا تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں ناشتہ سب کو کھلایا جا رہا ہے۔ بستر کھولا جا رہا ہے۔ صبح کو جاگنے سے پہلے ایک صاحب جو لکھنؤ کے تھے اور پنچولی میں ستار بجایا کرتے تھے اور داڑھی رکھنے کی وجہ سے شوکت ان کو مولانا کہتے تھے ان کو پابند کیا تھا کہ روزانہ ستار لاؤ اور بھائی جان کے سرہانے کھڑے ہو کر بجاؤ۔ پہلے روز انہوں نے ہچکچانا شروع کیا تو شوکت نے کہا کہ جھجکتے کیوں ہو چائے میز پر آ گئی ہے۔ ان کو جگانے کا یہی طریقہ ہے۔ ورنہ بھائی جان نہیں جاگیں گے۔ ان بے چارے نے بجانا شروع کیا ارشد صاحب آواز سن کر جاگے اور کہا شوکت یہ کیا بدمعاشی ہے۔ شوکت بولے ہمارے یہاں تہذیباً پکارا نہیں جاتا۔ ایسے ہی جگایا جاتا ہے۔ غرض دن رات یوں ہنستے گزرتے رہتے۔ وہ دن یاد آتے ہیں اور مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میرا بھائی اب بھی زندہ ہے۔ اپنے منہ سے اس کو کیسے کوسوں بچپن سے لے کر اب تک اس کی زندگی میری نظروں کے سامنے پھر رہی ہے۔ شوکت کیا مجھے چاہتا تھا اور اس کی ہر چیز ہر بات سے میں کیسا کیسا خوش ہوتی تھی۔

لڑکپن میں سب سے پہلے جب سائیکل چلانا سیکھی تھی تب مجھے پکارا تھا کہ باجی، باجی جلدی آیے، دیکھو مجھ کو سائیکل چلانا آ گئی اور باجی اپنے بھیا کی ہر بات سے مارے خوشی کے پھولے نہ سماتی۔ دنیا کی کوئی ایسی بات نہ تھی جس میں باجی سے مشورہ نہ کیا جاتا ہو۔ باجی اور بھائی جان اس کی چیزوں سے جتنا خوش ہوتے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ جتنی داد ہر نئی ذہانت کی اس کو میں اور ارشد صاحب دیتے اور کوئی نہ دے سکتا۔ بڑے ہونے پر بھی وہ ہمارے ساتھ بچہ بن جاتا اور ارشد صاحب بھی اس کے ہم جولی بن جایا کرتے تھے حالاں کہ وہ اس

سے 18 سال بڑے تھے۔

ایک بار 1926ء میں جب لکھنؤ سے میرے پاس آیا تو ہم لوگ ریاست بھوپال کی ایک دور افتادہ تحصیل میں تھے۔ اسی لیے اماں نے لیچیاں اور بہت سے پھل بھیجے تھے اور شوکت اپنے دونوں بھانجوں سلمان اور سلطان کے لیے گیند اور دو بیٹ اور ننھے عمران کے لیے ننھا بڑا سا کھلونا لائے۔ بڑے بھڑیں جن کو تتیا بھی کہتے ہیں۔ پھلوں کے ٹوکرے پر آ جا رہی تھیں ایک بھڑ ادھر آئی جہاں ہم سب بیٹھے تھے۔ ارشد صاحب بیٹ لے کر کھڑے ہو گئے بھڑ کو مارا اور نیچے گری اور پاؤں بڑھا کر جوتا سے کچل دیا۔ اب بھلا شوکت سے کہاں صبر ہوتا دوسرا بیٹ لے کر وہ بھی کھڑے ہو گئے اور جس طرف بھڑیں آ جا رہی تھیں اس طرف جا کر کہنے لگے آیئے بھائی جان مقابلہ ہو جائے دیکھیں کون زیادہ بھڑوں کو مارتا ہے پھر کیا تھا دونوں بھائی جُٹ گئے کچھ نہیں کچھ نہیں تو سو سوا سو بھڑیں مار ڈالیں اگر چائے نہ لگا دی جاتی تو معلوم نہیں کب تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ لیکن نتیجہ کسی کے حق میں نہ نکلا۔ بغیر ہار جیت کے یہ بازی ختم ہو گئی۔

ایک روز بستی میں گھومنے گئے وہاں کچھ ہندوؤں کو چوسر کھیلتے ہوئے دیکھا گھر آ کر بولے ہم بھی چوسر کھیلیں گے۔ چوسر منگوائی گئی اور کھیلنے والے کو بلا کر اس کے قاعدے سیکھے اور کئی روز تک یہی مشغلہ رہا۔ لکھنؤ جاتے وقت مجھ سے اس کی بساط سلوائی اور کہا کہ کوڑیاں اور گوٹیں لکھنؤ میں خرید لوں گا۔ کچھ عرصے کے بعد آپ کا خط آیا کہ پچیسی کے علاوہ میں نے شطرنج کی بھی مشق کر لی ہے۔ اب کے آپ لکھنؤ آئیں گے تو اس پر بھی میری ذہانت کا اندازہ کیجیے گا اور جب کچھ عرصے کے بعد ہم لوگ لکھنؤ گئے تو شوکت اپنے بھائی جان کے ساتھ پچیسی بھی کھیلتے رہے اور شطرنج بھی پھر جلدی اکتا گئے۔ ادبی ذوق کی تکمیل کا وقت ضائع ہوتا تھا۔ شوکت اور میں مزے مزے کی باتیں کرتے اور پھر وہ قلم لے کر بیٹھ جاتا اور مضمون لکھتا ہم دونوں میں جو باتیں ہوتیں اسی پر مضمون تیار ہو جاتا۔ میں بھوپال میں چلی آئی تھی اور جب وہ مضمون چھپ کر آتا تو خاص طور پر مجھ کو بھیجتا۔

اپنے بھائی جان کے اتنے عاشق زار تھے کہ بہانہ ڈھونڈھ کر ان کو لکھنؤ بلواتا۔ جب

میرا پہلا لڑکا (سلمان الارشد) پیدا ہوا میں لکھنؤ میں تھی۔ اماں نے کہا اپنے بھائی جان کو اطلاع تار دے دو۔ لکھو نیا زچہ بچہ خیرت سے ہیں۔ آپ کو ارشد صاحب کو بلانے کا موقع ہاتھ آ گیا اور تار میں اپنی طرف سے یہ ترمیم کر دی کہ باجی سخت بیمار ہیں فوراً آیے۔ ارشاد صاحب نے گھبرا کر اسپیشل چھٹی لی، لکھنؤ پہنچے۔ معلوم ہوا سب خیریت ہے۔ جب پوچھا گیا ایسا تار کیوں دیا تو شوکت نے کہا آپ کو بلانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس سے میری وابستگی کا یہ عالم ہے کہ میرے لڑکوں میں اس کی خصوصیات الگ موجود ہیں۔ بڑا لڑکا سلمان ماموں کی طرح قلم کا دھنی ہے دوسرا سلطان خوشش گفتاری اور بذلہ سنجی، خوش لباسی میں بالکل ماموں کی طرح ہے۔ تیسرا عمران اس میں ماموں کی وہ سنجیدگی ہے جو چھٹی لینے کے بعد وہ اختیار کر لیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے شوکت کو بھی تین بیٹے دیے ہیں ان کے نام میرے اور ارشد صاحب کے رکھے ہوئے ہیں لیکن شوکت کو لڑکی کی تمنا بھی بہت تھی اور ایک دفعہ لکھنؤ سے خط میں لکھا لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ زچہ بچی بخیریت ہیں مگر کم زور بہت ہے۔ شوکت کو معلوم تھا کہ جب تک سعید عمر نہیں ہوا تھا تو بھائی کی اولاد کی بہن کو کتنی تمنا تھی اور ان لڑکوں کے ہونے کے بعد باجی کو بھی ارمان تھا کہ بھتیجی بھی ہو اس لیے یہ لکھا تھا کہ میں خوش ہو جاؤں گی سب نے کہا جب لکھنؤ آئیں گی تو کہاں سے لڑکی دکھاؤ گے۔ کہنے لگے دو تین روز میں لکھ دوں کہ ختم ہو گئی تو بھودج کے منہ سے نکلا خدا نہ کرے کہنے لگے اچھا ہوئی بھی نہیں اور برا تی ہو۔

خدا نے اس کی یہ تمن بعد میں پوری کر دی۔ لاہور میں جب زہرہ خاتون سے شادی ہوئی تو سب سے پہلے بچی ہوئی جس کا نام برسوں پہلے سے میں نے شوکیہ رکھ رکھا تھا۔ اس کے بعد دوسری بچی فوزیہ پیدا ہوئی پھر تیسری شاہدہ۔ اس طرح انسانیت کا حساب برابر رہا۔ یعنی پہلی بیوی کے تین لڑکے سعید عمر، خورشید عمر، رشید عمر، دوسری بیوی کے تین لڑکیاں شوکیہ، فوزیہ، شاہدہ۔ بچیاں بڑی پیاری معصوم ہیں مگر ان پر سے اللہ میاں نے باپ کا سایہ جلد اٹھا لیا۔ ان بچے بچیوں سے اس لیے بھی محبت ہے کہ ان میں بہت سی چیزیں شوکت کی ہیں اور خود اپنے بچوں میں جب یہ خصوصیات دیکھتی ہوں تو ان کو بھی اس لیے چاہتی ہوں کہ میرے بھائی کی یہ چیزیں ان میں موجود ہیں۔ شوکت کو اس لیے چاہتی تھی کہ اس میں بہت سی چیزیں ابا کی تھیں۔

ابا جب یاد آتے تھے تو بھائی کو دیکھ کر دل کو تسلی دیتی تھی کہ باپ نہ سہی بھائی موجود ہے۔ اب میں کیا کروں کیسے یقین کروں میرا بھیا ہمیشہ کے لیے مجھ سے روٹھ گیا۔ میں بدنصیب اپنی شدید علالت کی وجہ سے دیکھ بھی تو نہ سکی کیسے دل کو سمجھاؤں۔ دل یقین نہیں کرتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ میرے باپ کے گھر کا چراغ گل ہو گیا۔ میرے دل پر قیامت گزرتی ہے مگر پھر سوچتی ہوں نہیں اس کے لڑکے لڑکیاں سب اسی چراغ سے چراغ روشن ہوتے ہیں ان کو کلیجے سے لگاؤں دل کو سمجھاؤں ہائے میرے بھیا تو کہاں ہے تیری ماں جائی تڑپتی ہے تو صرف تنہا بھائی تھا بتا کیا کروں تجھ کو کس طرح بھلاؤں۔ ہائے میرا بھائی کہاں چلا گیا۔ رات رات بھر آنکھوں میں کاٹتی ہوں۔ تجھ کو کسی نے یہ تک نہ بتایا کہ ماں جائی سخت بیمار ہے۔ ہائے سوچتا ہوگا کیسی بہن ہے جو نہیں آئی۔ معلوم نہیں کیا کیا سوچتی ہوں، روتی ہوں کیا کروں، اللہ تو بتا کیا کروں۔ سعید، خورشید، رشید، شوکیہ، فوزیہ، شاہدہ تم نہ روؤ مجھ کو رونے دو اپنی پھوپھی کو دھاڑیں مارنے دو، تڑپنے دو، میرا تو صرف ایک بھائی تھا اب کچھ نہیں۔ تم بچے ہو تم چھ بھائی بہن ہو اپنی ماؤں کو تسلیاں دو۔ ان کے کلیجے سے لگ جاؤ خوش رہنے کی کوشش کرو۔ میرا دل تڑپ رہا ہے۔ اب لکھا نہیں جاتا کیسے یقین کروں کس طرح دل کو سمجھاؤں۔ دل چاہتا ہے آنکھ کھل جائے اور یہ سب خواب ہو۔ میرا بھائی زندہ ہو کاش ایسا ہو سکتا۔ کراچی سے جانے کے بعد میں نے دیکھا ہی نہیں۔ بہت دل کو سمجھاتی ہوں کہ وہ تو پنڈی میں ہے نہ یقین کرو ہائے میرے قلم سے آج تک لفظ مرحوم نہیں نکلا۔ کیسے لکھوں۔ میں نے تو پروگرام بنایا تھا کہ لڑکیوں کی چھٹیوں میں پنڈی جاؤں گی اب کس کے پاس جاؤں۔ پیارا بھائی اب کبھی دیکھنے کو نہیں مل سکتا۔ کبھی نہیں مل سکتا۔

ہائے شوکت تو کہاں چلا گیا!

* * *

ابّا

رشید عمر تھانوی

اپنے دکھ درد کو سینے میں چھپا کر دوسروں کو ہنسانے والا البرٹ ہسپتال کے کمرہ نمبر 15 میں پڑا تھا۔ جگر کا سرطان، دل کا عارضہ، تنفس کا یہ عالم کے باہر کھڑا شخص سانس کی آواز سن سکے۔ کھانسی جب آتی تو تھوک میں خون کی آمیزش کتنی تکالیف تھیں لیکن پھر بھی اپنی کسی تکلیف کا اظہار نہ کیا۔

زندگی بھر کس کے وجود سے دوسروں کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلی، جس کے چھوڑے ہوئے شگوفوں سے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔ اب وہی شگوفوں کا منبع اپنے روگ سے، اپنے دکھ درد سے دوسروں کی آنکھیں نم کرتا یہ ان کا شیوہ نہ تھا۔ وہ خود اپنے ہی دکھوں کے بوجھ تلے دبتا گیا اور ان حالات میں بھی انہوں نے اپنی آخری ہچکیوں تک دوسروں کے لبوں کو تبسم دیا چہروں کو شگوفہ بنایا۔

سب سے شوکت تھانوی چھن گیا مجھ سے میرا باپ۔ سب کو اس کی ظرافت یاد آئی، مجھے اس کی شفقت، شوکت تھانوی تو اب بھی زندہ ہے اور مدتوں اپنی تصنیف کے پردے میں زندہ رہے گا، لیکن میرا باپ! وہ میٹھی نیند سو رہا ہے، سکھ کی نیند، چین کی نیند، جس میں نہ تو اسے تنفس کی تکلیف ہے کہ ہر اک سانس ہے مستقل مدت گویا۔ نہ وہ دکھ درد، نہ وہ زندگی کی تلخیاں جو آخر کار جگر کا ناسور بن کر ابھریں۔ اب میں کس سے کہوں کہ کوئی اسے اس نیند سے چونکا

دے اور میرا بچپن پھر لوٹ آئے، اس موڑ پر .. جب میں اپنے پنگوڑے پر لیٹا چسنی یا ہاتھ کا انگوٹھا چوستا اور آغوں آغوں کی گردانیں گردانتا، ابا آتے اور دور ہی سے "بابا" کہہ کر پکارتے، میں اپنی تمام مصروفیت چھوڑ، اس مانوس آواز کی طرف دھیان دیتا، ابا میرے پالنے پر جھک کر اپنی انگلی میرے ہونٹوں پر رکھ کر کہتے۔ میرا ابا بابا ہے، ببو ہے، گڈو ہے، ان کو اپنے پر جھکا دیکھ کر میری چسنی منہ سے ڈھلک جاتی، میں کھلکھلا پڑتا اور اپنے ہاتھ پیر ہلانے لگتا وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر ببو، ببو کہہ کر اچھالتے اور نا معلوم کیا کیا کہتے۔ پھر مجھے پالنے پر لٹا دیتے اور میں انہیں "آغوں آغوں" کر کے تکا کرتا اور سوچتا کہ یہ کون حضرت ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ لیکن ہیں پھر بھی بھلے آدمی، مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ جبھی تو اس طرح منہ بنا بنا کر چٹکی بجا بجا کر، بابا، بابا کہہ کر پکارتے ہیں۔ جب وہ مجھے پنگوڑے پر تنہا چھوڑ کر چلتے تو مجھے دکھ ہوتا اور میں اس کا اظہار اپنے منہ کا پورا دہانہ کھول کر مختلف سروں سے کرتا۔ کبھی کبھی میرے آنسو امڈ آتے اور کبھی ان آنسوؤں سے پہلے ہی ابا پلٹ آتے۔

امی جان نے اب اپنے طوطے کو رٹانا شروع کر دیا اور اپنی گود میں مجھے بٹھا کر ابا کی طرف اشارہ کر کے کہتیں "ابا" کہہ بابا ابا ابا یہ ہیں تمہارے "ابا" امی جان کی محنت اور اپنی کوششوں سے کچھ ہی دن اور ان سے اس حد تک متعارف ہو گیا کہ ان کا نام ابا ہے اور اب جب مجھے ان کی دور سے آواز آئی "بابا" تو میں "ابا ابا" کہہ کر ہاتھ پیر ہلانے لگتا اور اپنے پالنے سے مڑ مڑ کر ان کو دیکھنے کی کوشش کرتا تا کہ جلد ہی میرے قریب آئیں، مجھے ببو، گڈو، کہہ کر پکاریں اور پھر اپنی گود میں اٹھا لیں مجھے خوب اچھالیں۔ میں کھلکھلا پڑوں اور جب وہ مجھے چھوڑ کر چلیں تو پھر میں اپنا ریاض شروع کر دوں اور میری تانوں سے مرعوب ہو کر، متاثر ہو کر ابا پھر پلٹ آئیں۔

پھر کچھ عرصے انہیں کی گود میں رہ کر مجھے معلوم ہوا کہ دراصل ان کا نام ابا نہیں بلکہ یہ ابا میرے ہیں ان کا نام تو شوکت تھانوی ہے اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ میرا نام صرف بابا نہیں بلکہ اب جو کوئی میرا نام پوچھتا تو اس کو ابا کا سکھایا ہوا پورا نام رشید عمر بابا تھانوی بتاتا۔

ابا لکھنؤ میں سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ بالائی منزل پر ہم لوگوں کی رہائش تھی اور نیچے دفتر۔ ابا کی افسرانہ شان اور دفتر کی ٹھاٹ باٹ دیکھ کر مجھے بھی افسری کا شوق چرایا اور اپنی مستقل ضد پر ابا کے ماتحت کے ساتھ والا کمرہ ہمیں افسری کے لیے مل گیا اس میں میز سے لے کر گھنٹی، ردی کی ٹوکری سے لے کر پانی کی صراحی غرض یہ کہ سب کچھ موجود تھا۔ افسر صرف میز کرسی لے کر بیٹھا رہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کرتا اور پانچ منٹ بعد چپراسی کو بلا کر ڈانٹتا اور الٹے سیدھے حکم دیا کرتا۔ اتنا تو معلوم ہی تھا جو دفتر میں کام کرتا ہے اسے تنخواہ بھی ملتی ہے لہٰذا ہر پہلی تاریخ پر اکاؤنٹنٹ کے پاس موجود ایک پوٹلی ملتی جس میں دو روپوں کے ادھنے ہوتے، اس پوٹلی کو لے کر فوراً گھر جاتا اور ابا کی نقل کرتے ہوئے دور ہی سے امی جان کو پکارتا، بھئی جلدی تنخواہ لے لیجیے مجھے ابھی دفتر کا بہت کام کرنا ہے: امی جان اپنے کماؤ بیٹے سے تنخواہ لے لیتیں اور ہم پھر اپنے کمرے میں آ کر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے میں مصروف ہو جاتے۔

دفتر کے آگے دالان میں ابا اپنی زیر نگرانی مشاعرہ کراتے۔ فرشی مشاعرہ ہوتا۔ تمام بڑے بڑے شعرا آتے، رات بھر محفل جمی رہتی اور کشمیری چائے کے دور چلتے، اب یہ کیسے ہو سکتی تھی کہ تمام شعرا اپنا کلام سنائیں اور میں چپ رہوں۔ جوں ہی مشاعرہ شروع ہوتا ہم ابا کی گود میں ٹھنکتے، ابا ہم بھی غزل پڑھیں گے۔ آخر کار میری ضد ابا پوری کرتے اور میں مائیکروفون پر اپنا کلام سناتا:

نکا چل رہا ہے اور صاحب جا رہے ہیں

جب یہ محکمہ ختم ہوا تو ابا لاہور آ گئے اور یہاں پنچولی آرٹ پکچرس میں ملازم ہو گئے ہم سب کو لاہور آنا پڑا، ابا کو یقیناً لکھنؤ چھوڑنے کا غم تھا لیکن فکر معاش پر مجبور تھے اور مجھے جو غم تھا وہ اپنی افسری چھننے کا۔

اب میں کافی قابل ہو چکا تھا اور ابا کی سکھائی سینکڑوں گالیاں ازبر تھیں۔ بڑے بھائی سعید عمر تھانوی اور منجھلے بھائی خورشید شوکت کو اکثر و بیشتر ابا کا سکھایا سبق سنانا پڑتا، بھائی

جان کے ہاتھ میں گیند دیکھی اور فوراً کہا بھائی مجھے گیند دو، ان کے انکار پر پہلے تو اپنے سبق سے نوازتا اور پھر خود ہی روتا ہوا، منہ بسورتا ہوا ابا کے پاس پہنچ جاتا اور فی البدیہہ کہانی گھڑ دیتا، بھائی مجھے گیند نہیں دیتے اور بہت مارا ہے پھر فوراً مجھے گیند مل جاتی۔ میری التجا پر نہیں بلکہ دھونس سے۔ گھر کے تمام افراد کے علاوہ ابا کے کئی دوست بھی میری اس قابلیت کے تختۂ مشق بنے۔ ان میں سے جنگل چچا (سلطان) اب بھی مجھ کو یاد ہیں۔ جب پہلی دفعہ ابا کے ساتھ ان کے گھر گیا تو پارو چچی (بیگم سلطان احمد) میری اس قابلیت سے واقف تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اپنی گود میں بٹھالیا اور پوچھا ہمارا ''بیٹا ٹافی کھائے گا'' نیکی اور پوچھ پوچھ ''ہوں'' کہا۔ پھر کہنے لگیں ''ہم اپنے بیٹے کو بہت سی ٹافیاں دیں گے لیکن ایک شرط ہے وہ یہ کہ ڈرائنگ روم میں تمہارے ابا کے ساتھ تمہارے چچا بیٹھے ہیں، ان کے پاس جاؤ اور خوب گالیاں دے کر آؤ۔ بھلا میں کیوں چوکتا فوراً سینہ تان کر چل دیا۔ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، ابا نے کہا جنگل صاحب! آپ ان کو جانتے ہیں، وہ ابھی ہاں یا نہ بھی نہ کہنے پائے تھے کہ میں نے ایک لمبی چوڑی گردان شروع کر دی۔ وہ حیران، ابا ششدر کہ پارو چچی ہنستی ہوئی آئیں اور مجھے گود میں اٹھالیا، لیکن ٹافی دینے کا وعدہ پورا نہیں کیا، اسی لیے تو یہ واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ابا جب بھی پوچھتے میں کون ہوں اور میں ان کو الف سے لے کر یے تک سنا دیتا، ابا شاباشی دیتے اور قریب کھڑی امی جان کی طرف اشارہ کر کے پوچھتے یہ کون ہیں۔ پہلے تو میں امی جان کی غصیلی آنکھیں اور تیوریاں دیکھتا پھر آہستہ آہستہ کھسک کر ابا کی گود میں بیٹھ جاتا اور جب ہر طور سے اپنے آپ کو امی جان کی مار سے محفوظ پایا تو فر فر دس بیس گالیاں دے مارتا، امی جان ''خبیث'' کہہ کر بڑھتیں اور ابا مجھے چھپا لیتے، امی جان اس حرکت پر برستیں اور ابا کے قہقہے بلند ہوتے۔

امی جان کو عطر جمع کرنے کا شوق تھا۔ مجھے اس کو تباہ کرنے کی عادت۔ ابا امی جان کو جوں ہی باتوں میں مصروف پایا، چپکے سے کھسک گیا، کمرہ بند کیا، الماری سے عطردان نکالا، تیل کی خالی بوتلیں جمع کیں اور امی جان کے تھوڑے سے عطر کو تیل کی بوتلوں میں منتقل کر کے پانی

بھر دیا۔ پھر عطر سے تیار کردہ اس محلول کو اپنے بدن پر بھی چپڑا، کپڑوں کو بھی بسایا اور کمرے کے ہر گوشے کو معطر کرنے کی خاطر خوب چھڑکاؤ کیا۔ جوں ہی عطر کی خوشبو اڑ کر امی جان کی ناک تک پہنچتی وہ مجھ پر لعنت ملامت کرتیں اور ابا میری اس حرکت پر جی بھر کر ہنستے اور پر خطر حالات میں پناہ بھی ان ہی کی گود میں ملتی۔ اسی لیے امی جان سے میری نہیں بنتی تھی، وہ میری قابلیت کو سرے سے سراہتی ہی نہیں تھیں، بلکہ الٹا مجھے ''خبیث'' کہہ کر مارنے دوڑتیں اور منہ میں انگارہ رکھنے کی دھمکی دیا کرتیں۔ اس کے برخلاف ابا میری ہر حرکت پر خنداں ہوتے۔ میری کسی شرارت پر دھول دھپا کرنے کی بجائے اپنے سینے سے لگا لیتے۔ اسی لیے ابا سے خوب دوستی تھی۔ اٹھنا، بیٹھنا، سونا سب کچھ ان ہی کے ساتھ ہوتا۔ حالاں کہ اکثر رات ابا کو نہلایا بھی لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ سلاتے اور میں بھی جب تک ان سے چمٹ کر نہ لیٹوں نیند نہیں آتی تھی۔ ابا بھی میرے بغیر نہیں سو سکتے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے اب ابا کے اس خط سے ہوا جو کہ انہوں نے امی جان کو 15/جون 1945ء کو لکھا۔ جب کہ وہ تنہا لکھنؤ میں تھے اور ہم تینوں بھائی اور امی جان بھوالی (نینی تال) آئے ہوئے تھے:

> ''بابا مجھے اس قدر یاد آتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ اب تک یہ حال ہے کہ
> رات کو آنکھ کھل جاتی ہے کہ بابا کو پیشاب کرا لوں اور مجبوراً خود ہی
> پیشاب کر کے سو رہتا ہوں۔''

جب تک ابا گھر میں رہتے میں شیر تھا، جو دل چاہا وہ کیا۔ لیکن جوں ہی وہ دفتر روانہ ہوئے مجھے بھیگی بلی بننا پڑتا اور امی جان نے لیا ہمیں آڑے ہاتھوں۔ میری لاکھوں دھمکیوں کے باوجود کہ شام کو ابا سے شکایت کروں گا کہ آپ نماز پڑھ کر ہاتھ اٹھا کر ابا کو دیر تک گالیاں دیتی رہتی ہیں، پھر بھی مجھے پڑھنا ہی پڑتا۔ تھوڑے ہی دن میں، میں اس قابل ہو گیا کہ بڑی بڑی گالیاں بکنے کے علاوہ چھوٹی موٹی کہانیاں بھی پڑھ لیا کروں۔ پھر کیا تھا جب ابا دفتر جاتے وہ مجھ سے گالیوں کی فرمائش کرتے اور میں کہانی کی کتابوں کی۔ دن بھر میں تنہا اردو کی پہلی کتاب، سیپارہ اور امی جان ان کے ہاتھ میں پنکھا، چاہے گرمی ہو چاہے سردی یہ پنکھا ہاتھ میں

رکھنا ضروری تھا تا کہ مجھے بھی اس کی ڈنڈی سے نواز سکیں اور جب دل چاہے اسے جھل بھی سکیں۔ امی جان کی مار کھانے کے بعد، ٹسوے بہانے کے بعد تھوڑا بہت رو رو کر پڑھنے کے بعد ابا کے انتظار کی گھڑیاں شروع ہو جاتیں پھر ابا آئے اور میری امید سے زیادہ بہت ساری خوب صورت سرورق والی کہانی کی کتابیں لاتے۔ میں ابا سے مارے خوشی کے لپٹ جاتا۔ ابا خوب پیار کرتے پھر میں ان کتابوں میں منہمک ہو جاتا اور سوچتا کتنے اچھے ہیں ہمارے ابا۔

محمد طفیل صاحب (مالک ادارہ فروغ اردو) اکثر ابا کے پاس آتے تھے، جب ان کو ابا کے مسودات لے جاتے دیکھا تو ابا سے پوچھا کہ:

”ابا یہ آپ کے لکھے ہوئے کاغذ کیوں لے جاتے ہیں۔“

ابا سے معلوم ہوا کہ ان کاغذات سے ابا کا ناول چھپے گا۔ ابا کی کتابیں چھپیں گی اور میری نہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اب میں ہر وقت طفیل صاحب کا انتظار کرتا کہ وہ آئیں اور میں ان کو چھپنے کے لیے کہانی لکھ کے دوں۔ طفیل صاحب آتے تو کاغذ کے چند پرزے طفیل صاحب کے حوالے کر دیتا اور اپنی چھپی ہوئی کتاب کا انتظار شروع ہو جاتا۔ ابا سے برابر اپنی کتاب کی بابت پوچھتا اور ابا پیار سے کہتے۔“

”بس جلدی ہی چھپ کر آ جائے گی۔“

جب میری کوئی شرارت، شرارت کے دائرے سے بڑھ کر بدتمیزی بن جاتی تو ابا مجھ سے خفا ہو جاتے، لیکن مجھ پر زندگی بھر غصہ میں بھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ کرتے کہ میرا بستر گول کیا۔ ہتھیلی میں آٹھ آنے رکھے اور کہا چلیے گھر سے تشریف لے جائیں۔ پہلے ابا کی طرف رونی صورت بنا کر دیکھتا لیکن ان کے دوبارہ کہنے پر چل دیتا۔ کہاں باہر نکل کر گھر کا ایک چکر کاٹتا پھر کسی چور دروازے سے اندر آ جاتا اور کہیں چھپ کر بیٹھ جاتا۔ تھوڑی دیر بعد ابا کے گلے میں باہیں ڈال کر ان سے معافی مانگ لیتا۔ ابا مجھے نہ صرف معاف کرتے، چمٹا لیتے بلکہ اپنی جیب سے کچھ پیسے نکال کر بھی دیتے اور گھر سے نکالتے وقت کی اٹھنی اس کے

علاوہ ہوتی۔ ایک دفعہ چائے کی میز پر کوئی بدتمیزی مجھ سے سرزد ہوئی اور ابا نے ایک اٹھنی میری ہتھیلی پر ٹکائی اور گھر سے نکل جانے کو کہا، مجھ کو مجبوراً نکلنا پڑا۔ کوٹھی کا چکر کاٹا اور کوٹھی کے پیچھے نوکروں کے پیخانہ میں چھپ گیا۔ کافی دیر جب کھڈیوں پر بیٹھا بیٹھا تھک گیا تو سوچا کہ چلو قریبی دروازے سے اندر جھانکیں اور دیکھیں کہ ابا دفتر چلے گئے یا نہیں۔ اب جو اندر جھانکا تو کمرے میں کوئی نہ تھا۔ وہاں سے ہٹ کر گیراج کے پہلو سے کوٹھی کے آگے دیکھا تو ابا کوٹھی سے باہر نالے کے پل پر کھڑے تھے اور امی جان ان کے ساتھ تھیں۔ اتنے میں سعید بھائی، خورشید بھائی اور اقبال ماموں (اقبال صفی پوری) اپنی اپنی سائیکلیں لے کر آئے اور ابا نے ان سب کو مختلف سمتوں پر روانہ کر دیا۔ ابا کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ میں بے خیالی میں اب جھانکنے کی بجائے ان دونوں کے بالکل سامنے تھا کہ اتنے میں امی کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں پھر چھپ گیا لیکن دوسرے لمحے امی جن مجھ تک پہنچ گئیں اور مجھے گھر لے گئیں، جوں ہی ابا کو دیکھا میں نے رونا شروع کر دیا اور انہوں نے مجھے گود میں اٹھا لیا۔ میری ہچکیاں رک گئیں اور میں پہلے کی طرح شاداب ہو گیا۔

جب میرا بچپن اور جوانی آپس میں گلے مل رہے تھے، میری مسیں بھیگ رہی تھیں تو ابا کی فکر معاش انہیں کراچی لے گئی اور وہ روزنامہ ''جنگ'' کراچی کے مدیر ہو گئے۔ میری تعلیم نے مجھے لاہور ہی میں رکھا۔ اکثر ابا کی یاد اس درجہ ستاتی کہ دل چاہتا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں اڑ کر اپنے پیارے ابا تک پہنچ جاؤں۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں تو ہم سب کراچی چلے جاتے۔ میں گھنٹوں ابا کے دفتر میں بیٹھا رہتا وہ میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے اور جب وہ لکھنے میں مصروف ہوتے تو میں پیار بھری نظروں سے ان کو ٹکٹکی باندھ کے تکتا۔ صرف میں ہوتا اور میرے پیارے ابا۔

پھر جب روزنامہ ''جنگ'' راولپنڈی سے بھی نکلنے لگا تو ابا راولپنڈی آ گئے۔ اب گرمیوں کی چھٹیوں میں کراچی جانے کی وہ کشش ختم ہو جاتی تھی لیکن سعید بھائی کراچی ہی میں ملازم ہیں۔ اس لیے امی جان کے ساتھ کراچی جانا ہی پڑتا۔ پھر بھی کراچی جانے سے پہلے ہی

کم از کم ایک ہفتہ کے لیے وہ مری ضرور جاتا۔ مری جانا تو فقط ایک بہانہ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ابا کو دیکھنے کو جی چاہتا تھا اور میں مری جانے سے پہلے راولپنڈی میں ایک دن ابا کی صحبت میں گزارتا۔ جس میں وہ کبھی محبت بھری باتیں کرتے، کبھی اپنی بذلہ سنجی سے ہنساتے اور کبھی صرف خاموش ہو کر مجھے ان آنکھوں سے دیکھتے جس میں صرف محبت، پیار اور شفقت کی جھلک ہوتی پھر مری سے واپسی پر بھی ایک دن ایسا ہی گزرتا۔ ابا بھی وقتاً فوقتاً لاہور آتے، ہم لوگوں سے ملتے اور وہی بیتے لمحات لوٹ آتے۔ جب کبھی اپنی بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے ہم لوگوں سے ملے بغیر راولپنڈی چلے جاتے تو ہم سب کو بہت دکھ ہوتا اور میں اسی وقت شکایتوں سے بھرپور خط بھیجتا۔ گزشتہ سال مجھے معلوم ہوا کہ عیدالفطر کے موقع پر ابا لاہور ہی میں تھے۔ لیکن ہم لوگوں سے ملے نہیں تو مجھے بہت دکھ ہوا اور میں نے فوراً ان کو شکایت آمیز خط لکھا جس کے جواب میں اور باتوں کے علاوہ مجھے یوں سنایا:

> "میں عید منانے کے لیے نہیں بلکہ چیف سکریٹری مغربی پاکستان کی خواہش پر ایک ضروری باریابی کے لیے 7؍ مارچ کو رات کے تین بجے خیبر میل سے روانہ ہو کر 8؍ مارچ کو صبح نو بجے لاہور پہنچا اور اسی شام کو پانچ بجے کے ہوائی جہاز سے پنڈی واپس آ گیا۔ میں وہاں کسی سے نہ مل سکا، نہ ملنے کا وقت تھا۔ میرا قطعی عزم ہے کہ کم سے کم ایک ہفتہ کی چھٹی لے کر لاہور پہنچوں اور اپنے روٹھے ہوئے بچوں کو کلیجے سے لگا کر مناؤں، مگر میری یہ خواہش بہت جلد اس لیے پوری نہ ہو سکے گی کہ انتخابات سر پر ہیں۔ دوسرے ابھی دہلی کے لیے چھٹی لے چکا ہوں۔"

اور پھر ایک سال کی مدت کے بعد ابا واقعی لاہور آ گئے۔ ہم کو کلیجے سے لگا کر منانے کے لیے نہیں بلکہ موت سے گلے ملنے کے لیے اپنے روٹھے بچوں کو منانے کی بجائے وہ خود ہم سے روٹھ گئے۔

4/مئی کو سورج طلوع ہوا اور اپنی کرنوں میں رات کی سیاہی کے ساتھ ساتھ میری ماں کا سہاگ ـــــ بھی سمیٹ لے گیا۔ ایک چھناکے سے امی جان کی چوڑیاں ٹوٹیں اور پھر وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہیں اور پھر کلمہ شہادت فضا میں گونجا اور ابا کی بارات خدا کے گھر چل دی وہ بارات جس میں خوشی کے شادیانے نہ تھے بلکہ ہم سب کے بہتے آنسو، ابھرتی ہچکیاں۔

آج لڑکھڑاتی زبان سے کہنا پڑ رہا ہے: کتنے اچھے تھے ہمارے ابا، کتنے پیارے تھے ہمارے ابا۔ اتنے پیارے کہ خدا کو پیارے ہو گئے۔ اپنے کہنے پر یقین نہیں آتا، اس وقت بھی کون سا یقین تھا جب اپنی آنکھوں سے ان کے بے جان چہرے کو دیکھا۔ اپنے کاندھے پر سہارا دے کر ان کو ان کی آخری آرام گاہ تک لے گئے۔ اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈالی۔ جب سب کہتے ہیں تمہارا باپ مر گیا۔ تم یتیم ہو گئے تو بہتے آنسو ان کی اس بات کی صداقت تسلیم کر لیتے ہیں۔

○○

میری سرگزشت

(ریڈیو کی ایک تقریر)

شوکت تھانوی

دس منٹ میں کوئی اپنی سرگزشت تو خیر کیا بیان کرے گا البتہ "سرسری سرگزشت" بیان کر دے تو دوسری بات ہے، لہٰذا میں بھی اس صحرا کو ذرّے میں سمیٹنے اور اس سمندر کو قطرے میں جذب کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس اختصار کی بدولت اور کچھ نہ سہی لوگ مجھ کو کم عمر تو سمجھ ہی لیں گے کہ کیا ننھی سی عمر کی ننھی سی تفصیل ہے۔

یہ حادثہ 2 فروری 1904ء کو بندرابن ضلع متھرا میں پیش آیا کہ میں نے بھی کرشن جی کی جنم بھومی کو اپنی جنم بھومی بنا لیا۔ کوئی مناسبت نہ سہی لیکن ایک عجیب و غریب نسبت تو ہے اور اگر کوئی اس کو گستاخی کہے تو بھی اس بے ساختہ گستاخی کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ ہوش سے پہلے میں گوش کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بعض وہ باتیں جو میں نے اپنے متعلق سنی ہیں خود مجھ کو یاد نہیں ہیں کہ میں بچپن میں بے حد بیمار رہا کرتا تھا اور علاوہ دوسری وقتی بیماریوں کے ضعف معدہ کی شکایت نہایت تسلسل کے ساتھ جاری تھی اور اس کی وجہ سے نہایت سخت پرہیز ہوتا تھا۔ اتنا سخت پرہیز کہ میں والد صاحب کو کھاتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا اور اس کی وجہ سے خوش ہو جاتا تھا کہ میں نہ سہی میرا باپ تو کھانا کھاتا ہے اور اگر وہ کبھی شوربے میں ڈوبی ہوئی انگلی چٹا دیتے تو دیر تک چٹخارے لیتا تھا۔ سنا ہے کہ اسی زمانے میں سب سے پہلا شعر میں نے کہا تھا جس کا مطلع تھا کہ:

نہ دانا نہ پانی میں کس سے کہوں
ارے میرے اللہ میں کیا کروں

اس وقت میری عمر پانچ سال کی تھی اور یہ واقعہ میں نے نہایت تواتر کے ساتھ کئی مرتبہ والد محترم اور والدہ محترمہ سے سنا اور کچھ سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ شعر مجھ سے کیوں کر سرزد ہو گیا۔

میں نے اپنے ہوش کی آنکھیں بھوپال میں کھولیں جہاں والد محترم یوپی پولس سے مانگ لیے گئے تھے اور انسپکٹر جنرل پولس تھے۔ میں اس اسکول میں دو سال ہی رہنے پایا تھا کہ والد صاحب لکھنؤ آگئے۔ لکھنؤ میں میرا داخلہ چرچ مشن ہائی اسکول میں ہو گیا اور پھر گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں آگیا۔ جہاں میٹرک فیل ہونے تک رہا اس لیے کہ اس زمانے میں لکھنؤ میں فیل ہونے والے کلکتہ جا کر پاس ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا مجھ کو بھی کلکتہ جانا پڑا اور پھر لکھنؤ آگیا۔ اس زمانے میں، میں نے شاعر ہونا شروع کر دیا تھا اور والد صاحب سے چھپ کر سگریٹ پیتا اور شعر کہتا رہتا تھا۔ یہ طے تھا کہ اگر ان دونوں مشاغل میں سے کسی کی اطلاع والد صاحب کو ہو گئی تو طبیعت صاف کر دیں گے۔ مجھ کو اپنے اس زمانے کے اشعار میں سے صرف ایک شاہکار یاد ہے۔ ملاحظہ ہو!

تمہارا شربت دیدار ہی ان کو شفا دے گا
جو عاشق مرض مہلک کے کبھی بیمار ہوتے ہیں

"مرض" کی "ر" کو اگر ساکن کی بجائے متحرک کر لیتا تو بھی اس شعر پر کوئی آنچ نہ آتی۔ ایسا شعر اب باوجود کوشش کے میں نہیں کہہ سکتا۔ تمنا تھی تو صرف یہ کہ میرا کلام کسی رسالے میں چھپ جائے۔ آخر یہ حسرت بھی پوری ہو گئی اور لکھنؤ کے ایک رسالے میں جس کے نام ہی سے اس کا معیار ظاہر ہے یعنی "ترچھی نظر" میری ایک غزل چھپ گئی۔ کچھ نہ پوچھیے میری خوشی کا عالم، میں نے وہ رسالہ کھول کر ایک میز پر رکھ دیا تھا کہ ہر آنے جانے والی کی نظر اس غزل پر پڑ سکے۔ مگر شامتِ اعمال کہ سب سے پہلے نظر والد صاحب کی پڑی اور انہوں نے یہ غزل پڑھتے ہی ایسا شور مچایا کہ گویا چور پکڑ لیا ہو۔ والدہ محترمہ کو بلا کر کہا:

"آپ کے صاحب زادے فرماتے ہیں کہ:

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے
ترے کوچہ میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

میں پوچھتا ہوں کہ یہ جاتے ہی کیوں ہیں؟ کس سے پوچھ کر جاتے ہیں؟"

والدہ بے چاری سہم کر رہ گئیں اور خوف زدہ آواز میں بولیں:

"غلطی" سے چلا گیا ہوگا۔"

مختصر یہ کہ اب میں شوکت تھانوی بن چکا تھا اور اب کوئی طاقت مجھ کو شوکت تھانوی سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ اسی زمانے میں علی گڑھ جا کر جھانکنے کا موقع بھی ملا مگر ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ والد محترم کا انتقال ہو گیا اور مجھ کو تعلیم ادھوری چھوڑ کر فکر معاش میں مصروف ہو جانا پڑا۔ روزنامہ "ہمدم" اس دور کا بہت بڑا اخبار سمجھا جاتا تھا (بابائے صحافت سید جالب دہلوی اس کے ایڈیٹر تھے اور مجھ کو بحیثیت مترجم ان ہی کی تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا) سید جالب نے میرا سب سے پہلا مزاحیہ مضمون "میٹھے چاول" ایک رسالہ میں پڑھا اور دوسرے ہی دن مجھ کو حکم دیا کہ "ہمدم" کا فکاہیہ کالم "دو دو باتیں" لکھنے کی کوشش کرو۔ لہٰذا میں نے یہ مشق شروع کر دی۔ کچھ دن اور گزرنے کے بعد شذرات لکھوانا شروع کر دیے اور اب میں شعبۂ ترجمہ سے مستقلاً عملۂ ادارت میں آ گیا یہاں تک کہ پانچ سال بعد جب جالب دہلوی "ہمدم" سے رخصت ہوئے تو مجھ ہی کو ان کا چارج لینا پڑا۔ چند ہی دن بعد ملک نصر اللہ خاں نے آ کر چارج لے لیا اور میں روزانہ "اودھ اخبار" کی جو منشی نول کشور آنجہانی کا اخبار تھا ادارت پر آ گیا۔ "اودھ اخبار" کے بعد روزنامہ "ہند" کا ایڈیٹر رہا۔ خود اپنا روزنامہ "طوفان" کے نام سے جاری کیا۔

جب انقلابی حکومت نے راولپنڈی کو عبوری دارالحکومت بنایا تو "جنگ" نے بھی کراچی کے علاوہ راولپنڈی کو اپنا میدان بنایا اور میں "جنگ" راولپنڈی کی ادارتی ذمہ داری لے کر راولپنڈی آ گیا۔ جہاں اب تک موجود ہوں۔ اس تمام مدت میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ بچے تو خیر چند ہی ہیں مگر کتابیں تہتر ہو چکی ہیں۔ دس منٹ تو صرف ان ہی کے نام گنانے کے لیے درکار ہیں جواب ختم ہو چکے ہیں۔

IQBAL LIBRARY
& PUBL (REGD.)
IQB BHOPAL (M. P.)
Pin Code 46 PHONE 2542659
POST BOX No. 2

میری ایک غزل چھپ گئی۔ کچھ نہ پوچھیے میری خوشی کا عالم، میں نے وہ رسالہ کھول کر ایک میز پر رکھ دیا تھا کہ ہر آنے جانے والے کی نظر اس غزل پر پڑ سکے۔ مگر شامتِ اعمال کہ سب سے پہلی نظر والد صاحب کی پڑی انہوں نے یہ غزل پڑھتے ہی ایسا شور مچایا کہ گویا چور پکڑ لیا ہو۔ والدہ محترمہ کو بلا کر کہا' آپ کے صاحب زادے فرماتے ہیں:

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے
ترے کوچے میں ہم جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

میں پوچھتا ہوں کہ یہ جاتے ہی کیوں ہیں۔ کس سے پوچھ کر جاتے ہیں۔ والدہ بے چاری سہم کر رہ گئیں اور خوف زدہ آواز میں کہا:

"غلطی سے چلا گیا ہوگا۔"

(اسی کتاب سے)

RE SHAUKAT KA
KUCH BAYAN HO JAE

Mushtaque Azmi

ایک صاحب اپنے ایک دوست کی وفات حسرت آیات کی خبر سن کر رو پیٹ کر صبر کر چکے اور ان کے لیے دعائے مغفرت کر چکے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک دن وہی مرحوم ہٹے کٹے، زندہ سلامت چلے آرہے ہیں اور حسبِ معمول جوشِ محبت سے ان کو گلے لگانے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان صاحب نے چار قدم پیچھے ہٹ کر جلدی جلدی کچھ آیات پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا، ان دوست کے پیروں پر نظر ڈالی کہ پنجے آگے کی طرف ہیں یا ایڑی آگے ہے اور پنجہ پیچھے۔ ان کی آواز پر غور سے کان دھرے کہ یہ حضرت ناک سے تو نہیں بول رہے ہیں اور جب ہر طرح سے اطمینان کر لیا تو خود ان سے دریافت کیا کہ شاید آپ کا تو انتقال ہو چکا تھا پھر کیسے زحمت فرمائی؟ تو ان حضرت نے ہنس کر کہا۔ میں اس افواہ کی تردید کے لیے اصالتاً حاضر ہوا ہوں اور میری زندگی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں خود آپ کے سامنے حاضر ہوں اور اپنی ہی زبان سے اس افواہ کی تردید کر رہا ہوں۔ اس پر بھی ان کو کسی طرح اطمینان نہ ہوا اور انہوں نے کہا کہ ”یہ تو درست ہے کہ میں آپ کو زندہ سلامت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں مگر آپ کے انتقال کی جس شخص نے خبر دی ہے وہ آپ سے زیادہ قابلِ اعتماد اور آپ سے زیادہ سچا ہے۔ لہٰذا میں اس کے مقابلہ میں آپ کی شہادت کو کیونکر قابلِ اعتبار سمجھوں۔“

(اقتباس: پہاڑ تلے)

Edition: 2022

Price : ₹ 200/-

Published by
AZHA
PUBLICATIONS
170, Keshab Chandra Sen Street,
Kolkata - 700009
Mobile : 9123620415/9062155855